مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ

حقیقت شرک و توحید

حقیقت شرک و توحید

حقیقت شرک و توحید

تالیف:
مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

فاران فاؤنڈیشن
لاہور — پاکستان

سلسلہ مطبوعات نمبر ۹

جملہ حقوق محفوظ

جدید کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن

اہتمام: ——— حسن خاور

مطبع: ——— زی رِز گرافکس

اشاعت: ——— فاران فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام ۔ طبع سوم ۔ پانچ سو

تاریخ اشاعت: ——— جولائی 2013 ۔ رمضان المبارک 1434ھ

ادارہ: ——— فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،

ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان ۔ فون: 042-36303244

قیمت: ——— =/300 روپے

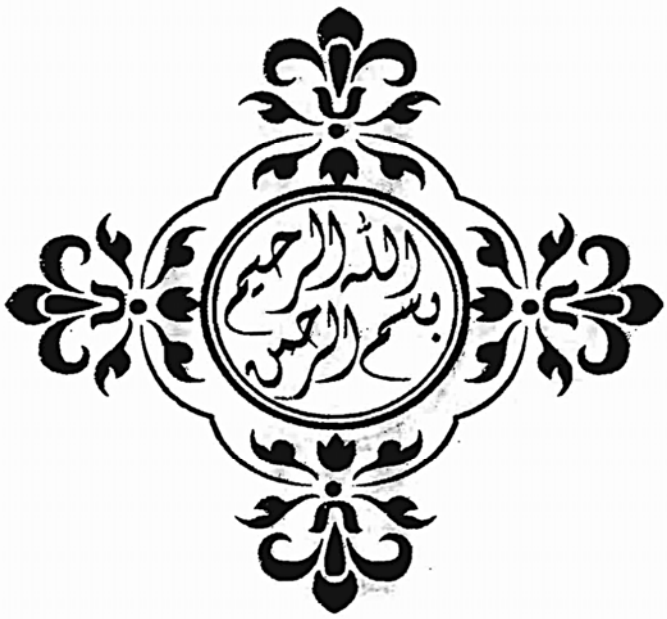
بسم الله الرحمن الرحيم

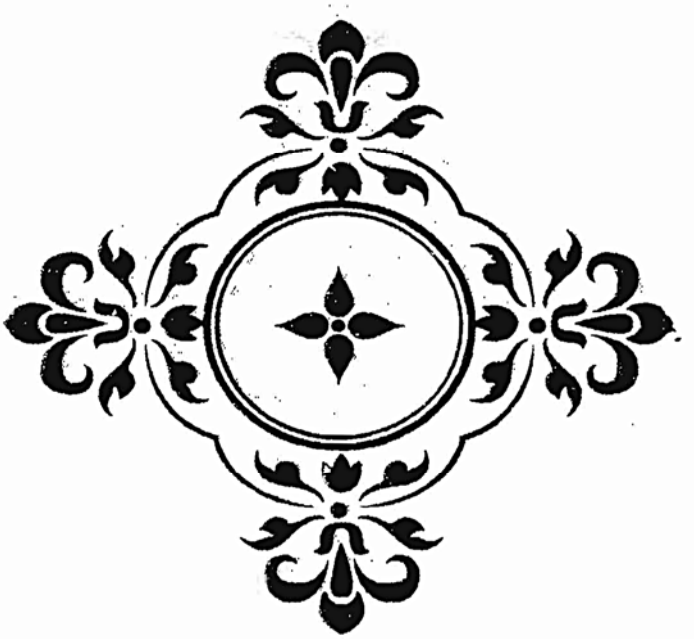

فہرس

دیباچہ ۱۱

حقیقتِ شرک

تمہید ۱۵

باب ۱ شرک کی حقیقت اور اس کے اقسام ۱۸

باب ۲ مشرکین کا شرک ۲۲

۱۔ ملائکہ پرستی ۲۴

۲۔ جنّات پرستی ۳۱

۳۔ کواکب پرستی ۳۶

۴۔ آباء پرستی ۴۱

۵۔ خود پرستی ۴۴

باب ۳ اہل کتاب کا شرک ۶۱

۱۔ احبار پرستی ۶۴

۲۔حضرت مسیحؑ کو رب بنانا	۶۷
۳۔پاکی و برتری کا دعویٰ	۷۷
۴۔ایمان بالجبت والطاغوت	۸۱
۵۔حمایت شرک	۸۴
باب ۴ منافقین کا شرک	۸۶
تحاکم الی الطاغوت	۸۷
باب ۵ پچھلے مباحث کا خلاصہ	۹۹
باب ۶ موجودہ دنیا کا سرسری جائزہ	۱۰۳
مشرق بعید	۱۰۳
ہندوستان	۱۰۸
مغربی یورپ اور امریکہ	۱۱۱
روس	۱۱۴
باب ۷ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ	۱۱۵
باب ۸ وقت کا اصلی فرض اور بعض شبہات کا ازالہ	۱۲۵
باب ۹ کیا شرک تقاضائے فطرت ہے	۱۳۷
باب ۱۰ شرک کا اصلی سبب	۱۵۵

حقیقت توحید

مقدمہ ۱۷۴

قرآن کے اولین مخاطب ۱۷۴

قرآن کا طرز استدلال ۱۷۵

قرآنی استدلال کی اساس ۱۷۷

بعض ضروری تنبیہات ۱۷۹

اس حصہ میں مباحث کی ترتیب ۱۸۱

باب ۱ توحید کے عمومی دلائل ۱۸۳

دلائل آفاق ۱۸۳

۱۔ کائنات کا حسن و جمال ۱۸۳

۲۔ کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق ۱۸۸

۳۔ ضد سے ضد کا وجود ۱۹۵

۴۔ متحدات سے مختلفات کا وجود ۱۹۶

۵۔ مظاہر کائنات کی تسخیر ۱۹۷

۶۔ کائنات کی محکم تدبیر ۱۹۹

۷۔ ہر نظم اجتماعی کے لیے لازم ہے کہ حاکمیّت غیر منقسم ہو ۲۰۲

۸۔ حق و باطل کی آویزش اور حق کا غلبہ ۲۰۳

۹۔ اشارات ۲۰۷

باب ۲ توحید کے دلائل انفس ۲۱۱

۱۔عہد فطرت	۲۱۲
۲۔علم ویقین کی فطری طلب	۲۱۹
۳۔فطرت انسانی کا علو	۲۲۲
۴۔انسان کا ضعف وافتقار	۲۲۸
باب ۳ توحید کے خصوصی دلائل	۲۳۲
دلائل بلحاظ مسلمات مخاطب	۲۳۲
۱۔شرکاء کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے	۲۳۳
۲۔لوازم سے استدلال	۲۳۶
۳۔دلیل عدل	۲۵۲
۴۔اہل کتاب اور منافقین	۲۵۴
باب ۴ پچھلے مباحث کا خلاصہ	۲۵۸
باب ۵ توحید کے اثرات	۲۶۱
باب ۶ توحید کی اہمیت دین میں	۲۶۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

اسلام کی اساس کلمہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ'' ہے۔ یہ کتاب اس کی شرح ہے۔ اس کے حصہ اوّل ـــــ حقیقت شرک ـــــ میں پہلے ٹکڑے یعنی ''لَآ اِلٰہَ'' اور حصہ دوم ـــــ حقیقت توحید ـــــ میں دوسرے ٹکڑے یعنی ''اِلَّا اللّٰہُ'' کی شرح ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حصہ اوّل میں بتایا گیا ہے کہ توحید کیا نہیں ہے۔ شرک کی حقیقت، اس کی قسمیں، اس کی خرابیاں اور انسانی فطرت سے اس کی نامناسبت پہلے حصہ سے پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ توحید کے دلائل کی تفصیل دوسرے حصہ میں ہے۔

اس کتاب کے لکھنے سے مقصود یہ تھا کہ دین کے بنیادی عقائد کی وضاحت قرآن حکیم کے فطری و عقلی دلائل کی روشنی میں کی جائے۔ ہمارے متکلمین نے ان مسائل پر جس نہج سے بحث کی ہے وہ یونانیوں کے فرسودہ طریق استدلال سے ماخوذ ہے، جس کے اندر عقل و فطرت کے لیے کوئی اپیل نہیں ہے۔ میں نے چاہا کہ قرآنی علم کلام کا پورا سلسلہ مرتب کر دیا جائے۔ یعنی شرک اور توحید کی طرح رسالت اور معاد سے متعلق تمام سوالوں کے جواب بھی قرآن کی روشنی میں دیے جائیں کہ قرآن کی عقلیت بھی آشکارا ہو اور عصرِ حاضر نے نئی نسل کے ذہنوں میں جو زہر پھیلائے ہیں ان کا تریاق بھی فراہم ہو۔ افسوس ہے کہ میں کلیۂ تفسیر کی طرف متوجہ ہو جانے کے سبب سے اس سلسلہ کی دو پیش نظر کتابیں ـــــ حقیقت رسالت اور حقیقت معاد ـــــ مرتب کرنے کی فرصت نہ پا سکا۔

اگر یہ دونوں کتابیں بھی مرتب ہو جاتیں تو یہ سلسلہ مکمل ہو جاتا، لیکن ان تمام مسائل پر تدبر قرآن میں اتنی وضاحت کے ساتھ میں بحث کر رہا ہوں کہ میرے رفقاء میں سے کسی کو توجہ ہوئی تو وہ بڑی آسانی سے حقیقت رسالت، اور حقیقت معاد، کے لیے سارا مواد تفسیر کے صفحات میں سے فراہم کر

لیں گے، مطالب میں ایک منطقی ترتیب قائم کرنے کے سوا کوئی اور زحمت ان کو اٹھانی نہیں پڑے گی۔

اس کتاب کی تالیف اہل قلم کے عام طریقہ کے مطابق نہیں ہوئی ہے کہ ایک عنوان سامنے آیا ہو اور محض ظاہری مناسبت کو سامنے رکھ کر اس سے متعلق کچھ آیتیں قرآن سے یکجا کر لی گئی ہوں اور کچھ مواد اِدھر اُدھر سے اکٹھا کر لیا گیا ہو اور پھر اس مواد کو جمع کر کے ایک کتاب بنا دی گئی ہو۔ بلکہ اس میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں تدبر قرآن کے سلسلہ میں میں نے بار بار جانچا پرکھا ہے، بار بار ان کے ضعف وقوت کا امتحان کیا ہے اور برسوں کی تنقید و تنقیح کے بعد اس خیال سے ان کو ٹانک رکھا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوگی تفسیر قرآن میں یہ اپنے اپنے مواقع میں بیان ہوں گے، ان ہی معلومات کا کچھ حصہ اس کتاب میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے تاہم مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے سب ٹھیک ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مجھ سے لغزشیں ہوئی ہوں، پس جو اصحاب علم کسی لغزش پر مجھے متنبہ فرمائیں گے میں نہایت مسرت اور کشادہ دلی کے ساتھ ان کی تنبیہات کا خیر مقدم کروں گا۔

یہ کاوش محض علمی تحقیق نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم مقصد کے لیے دعوت کے ساتھ ساتھ وقت کے نظام اور وقت کی سوسائٹی پر تنقید بھی ہے۔ علمی تحقیقات کو بعض لوگ خاموشی سے پڑھ لیتے ہیں، بعض اس کی تحسین کرتے ہیں، بعض اس کو مہمل قرار دیتے ہیں اور بعض یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، ان باتوں کو ہم بھی جانتے ہیں، لیکن وقت کے نظام اور سوسائٹی پر تنقید سے بہت سے لوگ آزردہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کی یہ آزردگی غصہ وغضب کی شکل اختیار کر لیتی ہے، مجھے تنقید کے جرم کا اقرار ہے اور اس کے لیے صفائی پیش کرنا فضول سمجھتا ہوں، لیکن میری نیت نیک ہے اور اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہوں کہ اگر میرے قلم سے حق نکلا ہے تو اس کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے اور اس کے اجر وثواب میں ان تمام دوستوں کو شریک کرے جو اس کتاب کے لکھنے کے محرک ہوئے اور اگر میرا قلم کہیں چوکا ہے تو اس کے اثر کو مٹا دے اور سب کو اس کے گناہ سے بچا لے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

والسلام

لاہور

یکم مارچ ۱۹۷۳ء

امین احسن اصلاحی (رحمۃ اللہ علیہ)

۱

حقیقتِ شرک

تمہید

شرک کی معصیت دوسری تمام معصیتوں کے مقابل میں، ایسی سخت وشدید ہے کہ کوئی مسلمان اس کی ادنیٰ نسبت بھی اپنی طرف گوارا نہیں کرتا، ایک عامی سے عامی مسلمان بھی ہر قسم کے الزامات سہ لے گا، ہر قسم کی معصیتوں کی نسبت اپنی طرف گوارا کر لے گا، ہر طرح کی آلودگیوں اور ہر قسم کے گناہوں کا اعتراف کر لے گا، لیکن اگر آپ اس کے کسی عقیدہ یا عمل میں کسی معمولی شائبہ تک کی بھی نشان دہی کیجیے گا تو تلملا اٹھے گا۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ جدید علوم وافکار سے متاثر ہیں، ان کا ذہین طبقہ بھی، بلا امتیاز مذہب وقوم، شرک سے بیزاری ضرور رکھتا ہے، خواہ توحید کے لیے اس کے اندر کوئی حمیت ہو یا نہ ہو، ان کا خیال ہے کہ اس زمانہ میں الحاد ہے یا توحید، شرک جیسی وہم پرستی میں اس زمانہ کا عقلیت پرست انسان مبتلا نہیں ہوسکتا، اور ان میں سے ہرگز کوئی شخص اس بات کا روادار نہ ہوگا کہ آپ اس کی طرف شرک کی نسبت کریں۔

ایک آدمی جس کے پاس قرآن وحدیث کا کچھ علم ہو، جب شرک سے لوگوں کی اس بیزاری ونفرت کو دیکھتا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کے اعمال وعقائد اور دنیا کے احوال ومعاملات پر غور کرتا ہے تو اس پر سخت حیرت سی چھا جاتی ہے، وہ اپنے علم اور لوگوں کی شہادت میں کھلا ہوا تضاد پاتا ہے، وہ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ گوشہ گوشہ میں شرک کی نجاست پھیلی ہوئی ہے لیکن دوسروں کو اس بات پر متفق اللفظ پاتا ہے کہ دنیا اس نجاست سے پاک ہوچکی ہے، اور اگر اس کا کچھ نشان باقی ہے تو ایسی ناقابل ذکر اور غیر موثر

حالت میں ہے کہ اس کے لیے چنداں فکر و اہتمام کی حاجت نہیں ہے، زمانہ کی ترقی اور علم کی اس وسعت سے وہ آپ سے آپ مٹ جائے گا، اپنی رائے کی مخالفت میں دوسروں کا یہ اتفاقِ کلمہ ایک نیک نیت آدمی کو مشتبہ کر دیتا ہے اور بسا اوقات اپنے علم کو متہم کرنے لگ جاتا ہے کہ ممکن ہے میں نے ہی شرک کا مفہوم غلط سمجھا ہو، ممکن ہے توحید کی تعریف میں اصل حقیقت سے میں ہی دور جا پڑا ہوں، کمرے میں بدبو تو ضرور ہے لیکن جب سب یہی کہہ رہے ہیں کہ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو پھیل رہی ہے تو ہو نہ ہو اس وقت کچھ میرا ہی دماغ گڑبڑ ہے۔ یہ چیز کچھ دیر کے لیے اس کو مذبذب اور متردد کر دیتی ہے، لیکن جب بار بار کے تجربہ کے بعد بھی اسے اپنی ہی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے اور بدبو کے وجود سے انکار کرنا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے تو اس وقت دو ہی راہیں اس کے سامنے ہوتی ہیں اگر رائے عام کی مخالفت کی جرأت اس میں نہیں ہے تو وہ مجبور ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرح خود بھی بدبو کو خوشبو کہنے لگے اور اگر رائے عام کی پروا اتنی نہیں ہے کہ اس کی خاطر حق کو جھٹلا سکے تو وہ اپنی قوت شامہ کی تصدیق کرتا ہے اور دوسروں کو یا تو صاف صاف خبردار کر دیتا ہے کہ وہ کسی مصلحت سے بدبو کو خوشبو کہہ رہے ہیں یا خیال کرتا ہے کہ ان کو خوشبو اور بدبو میں امتیاز ہی نہیں ہے۔

میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں اور دوسری مدعی توحید جماعتوں کے بارہ میں یہی آخری رائے رکھتا ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر شرک سے جو بیزاری اور توحید کے لیے جو عصبیت ہے اس کے پیچھے کوئی صحیح علم و شعور نہیں ہے، وہ محض ایک پندار ہے جو ان کی مذہبی و تاریخی روایات کے توارث پر قائم ہے وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں ابطال شرک کی ایسی شاندار تاریخ رکھتے ہیں، کیسے ہو سکتا ہے کہ اسی باطل میں خود مبتلا ہو جائیں؟ مسلمانوں کے سوا جو دوسری جماعتیں توحید کی مدعی ہیں ان کے نزدیک شرک سے بیزاری اور توحید کی حمایت ایک علمی تفاخر کے قسم کی چیز ہے جس طرح کوپرنیکس نے قدیم خیال کے خلاف دعویٰ کیا کہ زمین کی حرکت کا مرکز سورج ہے اور گیلی لیو نے دوربین ایجاد کر کے اس دعویٰ کو حقیقت ثابت کر دیا، اسی طرح جدید تجربات و مشاہدات نے ان

لوگوں کے خیال میں شرک کی تمام وہم پرستیوں کو مٹا دیا ہے اور علم و تحقیق کے اس دور میں اب ان میں گرفتار ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ ان لوگوں کو کچھ خبر نہیں کہ شرک فی الحقیقت ہے کیا؟ اس کی صورتیں اور قسمیں کیا کیا ہیں؟ ہماری علمی، اخلاقی اور سیاسی زندگی پر اس کے کیا کیا اثرات پڑتے ہیں؟ ان میں سے وہ کسی ایک بات سے بھی واقف نہیں ہیں، ان کے نزدیک اس معاملہ کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی ایک علمی غلطی تھی علم انسانی کی ترقی نے جس کی اصلاح کر دی۔ شرک کا ایک بہت ہی تنگ مفہوم ''بت پرستی'' یا ''نیچر پرستی'' ان کے ذہن میں ہے، اور ان کا کہنا یہ ہے کہ جب نیچر کے اتنے اسرار منکشف ہو چکے ہیں کہ قریب ہے انسان زمین و آسمان اور زمان و مکان کے خداوند ہونے کا دعویٰ کر سکے تو دریاؤں، پہاڑوں، سیاروں اور ستاروں کی بندگی کے کیا معنی؟

یہ صورت حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حکیمانہ بات یاد دلاتی ہے، ایک مرتبہ آپ سے کسی شخص کی نیکی کی تعریف کی گئی کہ وہ تو اس قدر نیک ہے کہ بدی کو جانتا بھی نہیں، آپ نے اس کی تعریف سن کر فرمایا: تب تو اس کے بدی میں پڑ جانے کا بڑا احتمال ہے، کیونکہ جو شخص بدی اور نیکی میں امتیاز ہی نہیں کر سکتا وہ ہر وقت بدی میں مبتلا ہو سکتا ہے ہمارے نزدیک ٹھیک یہی حال ابنائے زمانہ کا ہے۔ یہ لوگ دین سے اس قدر بے خبر ہیں کہ دنیا کی اس سب سے بڑی برائی سے، جس کا نام شرک ہے، اچھی طرح واقف ہی نہیں ہیں، اور جو شخص بیماری کو بیماری جانتا ہی نہ ہو وہ اگر بیماری کا کچھ اندازہ نہ کر سکے یا بیماری ہی کو صحت خیال کرنے لگ جائے، تو کیا تعجب! پس وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت ہے کہ اس جاہلیت کی جس کو قرآن نے ظلم عظیم کہا ہے، تشریح کی جائے تا کہ توحید کی صحیح حقیقت اجاگر ہو اور حق و باطل کے یہ دونوں نقطے اس قدر نمایاں ہو جائیں کہ التباس کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ (الانفال ۸:۴۲) (تا کہ جس کو ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے)۔

باب ۱

شرک کی حقیقت اور اس کے اقسام

کسی شے کا صحیح تصور اس کی صحیح تعریف کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اس وجہ سے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم شرک کی تعریف کریں اور اس کے بعد اس کے اقسام وفروع پر بحث کریں۔

قرآن مجید اور احادیث رسول میں جن چیزوں کو شرک قرار دیا گیا ہے، ان کو سامنے رکھ کر، اگر شرک کی تعریف کی جائے تو اس کی تعریف یہ ہوگی۔

''خدا کی ذات یا اس کی صفات میں جس مفہوم میں وہ خدا کے لیے مستعمل ہیں، یا اس کے حقوق میں کسی کو سا جھی ٹھہرانا۔''

اس تعریف کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے کسی قدر توضیح کی ضرورت ہے۔

خدا کی ذات میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کو کسی سے یا کسی کو خدا سے قرار دینا، کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا، کسی کو اس کا باپ یا بیٹا کہنا، مثلاً عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ مسیحؑ خدا کے جوہر سے ہیں یا خدا نے ان کو جنا ہے یا حضرت مریمؑ خدا کی ماں ہیں یا عربوں کا یہ عقیدہ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ یہ ساری باتیں خدا کے قدیم اور ازلی وابدی ہونے اور ان تمام صفات کمال کے منافی ہیں جن کا ماننا عقل، فطرت اور مذہب کی رو سے لازم ہے۔ یہ شرک فی الذات ہے۔[1]

---

[1] عقیدہ وحدت الوجود کی تقریر مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے، اس کی بعض صورتیں بالکل اس کے تحت آجاتی ہیں، بالخصوص جس صورت میں وہ گیتا اور ہندو فلسفہ میں ہے، اس کے شرک فی الذات ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔

صفات میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ جو صفات کمال خدا کے لیے مخصوص ہیں، مثلاً خلق، تدبیر، قدرت، علم، حکمت وغیرہ، ان میں کسی کو ساجھی قرار دینا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ قید لگی ہوئی ہے کہ جس مفہوم میں وہ خدا کے لیے مستعمل ہیں۔ اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ یہی صفتیں بسا اوقات ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب ہم ان کو خدا کے لیے بولتے ہیں تو ان کا مفہوم بالکل خاص ہوتا ہے جو اس بے ہمہ و باہمہ ذات کے شایان شان ہوتا ہے، اور جب ان کو انسانوں کے لیے بولتے ہیں، تو خدائی مفہوم سے بالکل الگ کر کے بولتے ہیں، مثلاً حکیم کی صفت ہم خدا اور آدمی دونوں کے لیے بولتے ہیں، لیکن جب اس کو خدا کے لیے بولتے ہیں تو اس کا مفہوم اور ہوتا ہے اور جب انسان کے لیے بولتے ہیں تو اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے اور اگر انسان کے لیے بھی اس صفت کو اس مفہوم میں بول دیں جس مفہوم میں خدا کے لیے بولتے ہیں تو شرک فی الصفات ہوگا۔

حقوق میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی صفات کمال سے جو باتیں لازم آتی ہیں یا جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان میں کسی کو شریک ٹھہرانا مثلاً خدا خالق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ تمام عالم میں حکم و انتظام اسی کا ہو، اب فرض کیجیے کہ ہم یہ تو مانیں کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی مان لیں کہ ان کا انتظام خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہے تو یہ شرک فی اللوازم ہوگا اس لیے کہ خدا کے خالق ہونے سے جو بات لازم آتی ہے اس میں ہم خدا کے سوا ایک دوسرے کو شریک کر رہے ہیں حالانکہ جس نے خلق کیا ہے امر کا حق دار بھی وہی ہے، چنانچہ فرمایا ہے: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف ۷:۵۴)

جب تمام کائنات کی تدبیر امر اسی کے ہاتھ میں ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ بندگی صرف اسی کی کی جائے، اطاعت خالص اسی کی ہو، محبت حقیقی کا مرکز وہی ہو، اب فرض کیجیے کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کو بھی اختیار کر لیں، یا اس کی اطاعت کے خلاف کسی اور کی اطاعت کو جائز قرار دے لیں یا اس کو محبت حقیقی کا مرکز ٹھہرائیں تو یہ ساری باتیں شرک فی

الحقوق میں شمار ہوں گی۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے یہ مطالبہ کیا ہے:

وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ (البینۃ ۹۸:۵)

''ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ ۲:۱۶۵) (جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں) یعنی دوسروں کے ساتھ ان کی محبت خدا کی محبت کے تحت ہوتی ہے۔

یہ شرک کی اصلی قسمیں ہوئیں ان کے علاوہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اگرچہ فی نفسہٖ شرک نہیں ہیں اور مذکورہ بالا اقسام میں سے کسی کے تحت وہ نہیں آتی ہیں، لیکن وہ صورت شرک یا ذریعۂ شرک ہیں، اگر ان کو باقی رکھا جائے تو اس کا اندیشہ ہے کہ وہ اصلی شرک کا دروازہ کھول دیں گی، اسلامی شریعت کا اصول یہ ہے کہ وہ اصلی گناہ کے ساتھ ساتھ ان ذرائع کا بھی سد باب کرتی ہے جو اس گناہ کے محرّک ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے شریعت نے ان کو بھی ناجائز قرار دیا، مثلاً غیر اللہ کو سجدہ، یا بقصدِ تعظیم غیر اللہ کی قسم کھانا، چونکہ سجدہ ہمیشہ سے انتہائی تذلل کی نشانی خیال کیا گیا ہے اور مشرک قومیں اپنے معبودوں کی قسمیں بھی کھایا کرتی تھیں، اس وجہ سے اسلام نے جو آخری اور مکمل شریعت ہے، ان تمام صورتوں کا بھی خاتمہ کر دیا جو ذریعۂ شرک ہو سکتی تھیں اس قسم کے شرک کو شرک شبہی کہتے ہیں۔

شرک کی ان اقسام کی توضیح کے لیے مناسب ہوگا کہ ہم قرآن مجید سے ان کی مثالیں پیش کریں۔

قرآن نے اپنے زمانۂ نزول میں جن جماعتوں سے براہ راست خطاب کیا ہے اور ان کے افعال و معتقدات میں شرک کا پتا دیا ہے، وہ تین ہیں: اہل عرب (بنی اسماعیل) اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور منافقین۔ ان تینوں جماعتوں میں اہل عرب کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ قرآن نے ان کے لیے ''مشرکین'' کا لفظ بطور علم اور صفت کے استعمال کیا

ہے۔ بقیہ جماعتوں کی طرف فعل شرک کی نسبت تو ضرور کی ہے لیکن مشرک یا مشرکین کا لفظ بطریق علم یا صفت ان کے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری جماعتیں توحید کو اساس اور بنیاد کی حیثیت سے تسلیم کرتی تھیں، ان کے اور مسلمانوں کے درمیان توحید بطور ایک مسلمہ اور قدر مشترک کے تھی۔ یہود اور نصاریٰ میں سے کوئی بھی توحید کا منکر نہیں تھا اور منافقین تو اپنے تمام ظاہری اعمال و اعترافات میں گویا مسلمان ہی تھے۔ ان گروہوں کے اندر جو شرک تھا وہ ان کے اقرار و اعلان کے بالکل خلاف تھا۔ برعکس اس کے مشرکین شرک کو بطور ایک اساسی عقیدہ کے تسلیم کرتے تھے خدائی کے اس کارخانہ میں ان کے شرکاء نہ صرف شریک تھے بلکہ وہ ناگزیر تھے، شرک کو تسلیم کیے بغیر ان کے نزدیک اس کائنات کا معمہ حل ہی نہیں ہوسکتا تھا ان کی اس اہمیت کی وجہ سے شرک و توحید کی بحث میں قرآن نے بھی ان کو مقدم رکھا ہے اور ہم بھی ان مقدم رکھیں گے۔ چنانچہ ان کے اندر قرآن نے شرک کے جن اقسام کی نشان دہی کی ہے ہم پہلے ان کو اجمال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

باب ۲

مشرکین کا شرک

اہل عرب کے متعلق سب سے پہلی بات یہ جاننی چاہیے کہ ان میں کوئی جماعت خدا کی منکر نہیں تھی، بعض لوگوں نے ان کے قول وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ (الجاثیہ ۴۵-۲۴) (ہم کو تو بس گردش زمانہ فنا کرتی ہے) سے یہ استدلال کیا ہے کہ ان میں بعض جماعتیں خدا کی منکر یا باصطلاح جدید نیچری (NATURALIST) تھیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے عربوں میں نزول قرآن کے وقت دہریوں کی کوئی جماعت موجود نہیں تھی وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ (الجاثیہ ۴۵-۲۴) جو وہ کہتے تھے تو اس سے ان کا مقصود خدا کی ہستی کا انکار نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ بات وہ قرآن کے اس دعوے کی تردید میں کہتے تھے کہ قوم کے عروج وزوال کا انحصار اس کے عقائد واعمال کے صلاح وفساد پر ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کے لیے قرآن مجید ایک اخلاقی بنیاد قرار دیتا تھا، وہ عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین اور قوم فرعون کی تباہی کا سبب ان کے کفر وشرک، ظلم وسرکشی، فسق وعدوان اور ان کے دوسرے عملی واعتقادی فسادات کو بتاتا تھا اور عربوں کو متنبہ کرتا تھا کہ اگر انہوں نے اپنی اعتقادی واخلاقی غلطیوں کی اصلاح نہ کی تو اپنی قوت وجمعیت کے باجود مذکورہ قوموں کی طرح وہ بھی تباہ ہو جائیں گے یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، وہ قوم کے عروج وزوال میں کسی اخلاقی اصول کو کارفرما نہیں مانتے تھے، وہ قوم کو ایک درخت کے مانند سمجھتے، جو اُگتا ہے، نشو ونما پاتا ہے، پھل پھول لاتا ہے، یہاں تک کہ اپنی فطری قوتیں نچوڑ کر ایک دن گردش لیل ونہار کی نذر ہو جاتا ہے، یا ایک فرد

کے مانند سمجھتے تھے، جو پیدا ہو جاتا ہے، جوان ہوتا ہے، پھر کسی بیماری کے سبب سے، یا درازی عمر سے، ایک دن مر جاتا ہے موت وزیست کا جو طبیعیاتی ضابطہ کائنات کے ہر گوشہ میں کام کر رہا ہے وہ اسی ضابطہ کو قوموں کی موت وزیست میں بھی کارفرما مانتے تھے اور اپنے شعروں میں اسی نقطۂ نظر سے گزشتہ اقوام وقبائل کی تباہی کا ذکر کرتے تھے۔

قرآن مجید نے تاریخ ایک نئے نقطۂ نظر سے پیش کی تھی جو ان کے اس مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے بالکل مختلف تھا اور دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ان سے نئے اصول زندگی کا مطالبہ کرتا تھا جو ان کی خواہشات نفس کے بالکل خلاف تھا اس وجہ سے وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اور جواب میں یہ کہتے تھے کہ وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ قوم کی موت وزیست کو اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے قوموں کو تو صرف گردش روزگار فنا کرتی ہے قوم کی بدی کو اس کی تباہی میں کوئی دخل نہیں ہوا کرتا، اٹلی کے مشہور سیاسی فلسفی، مکیاولی کا مذہب بھی یہی ہے، وہ جب یہ کہتا ہے کہ حکومت ایک مجرد سیاسی وجود ہے، وہ نہ اخلاقی ہے نہ قانونی، فرمانروا اور مدبرین ملک کے تمام اعمال سیاسی کا محور صرف فائدہ پرستی کو ہونا چاہیے، جس کام میں حکومت کا بھلا ہو رہا ہو یا جس بات کے لیے حکومت کی قوت وصلاحیت مقتضی ہو، وہ ان کو کر گزرنی چاہیے، اس میں کسی ضابطہ قانونی واخلاقی کو مانع نہیں ہونا چاہیے تو وہ درحقیقت کوئی نئی بات نہیں کہتا، بلکہ ٹھیک ٹھیک عرب جاہلیت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔

الغرض اہل عرب نہ تو خدا کے منکر تھے اور نہ وہ خدا کی بنیادی صفات میں سے کسی صفت کے منکر تھے، وہ زمین وآسمان، سورج اور چاند اور ابر وہوا کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے، زندگی بخشنے والا، روزی دینے والا اور زندگی لینے والا اسی کو کہتے تھے، اپنی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو اسی کا عطیہ جانتے تھے اس کائنات کا انتظام وانصرام اسی کے دست تصرف میں سمجھتے تھے، لیکن ساتھ ہی بعض ایسی باتیں بھی مانتے اور کرتے تھے جن سے یا تو خدا کی صفتوں اور ان کے مقتضیات کا انکار لازم آتا تھا، جو کفر ہے یا خدا کی صفات اور اس کے حقوق میں دوسروں کی حصہ داری لازم آتی تھی، جو شرک ہے قرآن نے ان کے اس تناقض

پر ان کو جگہ جگہ متنبہ کیا ہے ہم صرف دو آیات نقل کرتے ہیں جو کافی ہوں گی۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (یونس ۱۰:۳۱-۳۲)

''ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو سمع اور بصر پر اختیار رکھتا ہے اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو ساری کائنات کا انتظام فرماتا ہے، تو جواب دیں گے: اللہ! تو ان سے کہو کہ کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟ پس وہی اللہ تمہارا رب حقیقی ہے تو حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے تو کہاں تمہاری عقل الٹ جاتی ہے؟''

اس تناقض نے اہل عرب کو خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسرے بہت سے خداؤں کی پرستش میں مبتلا کر دیا تھا جس سے خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق میں شرک کی بہت سی قسمیں پیدا ہو گئیں اور وہ آہستہ آہستہ ان پر چھاتی چلی گئیں۔

قرآن کی روشنی میں اگر ان کی مشرکانہ پرستشوں کی تحلیل کی جائے تو ان کی پانچ قسمیں نکلیں گی: ملائکہ پرستی، جنات پرستی، آباء پرستی اور خود پرستی، اب ہم ان میں سے ہر ایک پر، اختصار کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

۱۔ ملائکہ پرستی

اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں اور اس کی اولاد قرار دیتے تھے، جو صریحاً شرک فی الذات ہے اور اس سے اس کی شان بے ہمگی اور اس کے استغناء کی نفی لازم آتی ہے جو کھلا ہوا کفر ہے قرآن نے ان کے اس عقیدہ کی تردید اس طرح فرمائی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا

فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: (یونس ۱۰:۶۸)

''یہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے، وہ ایسی باتوں سے پاک ہے بے نیاز ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے، تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کیا تم اللہ پر وہ بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟''

ان فرشتوں کو وہ خدا سے قربت کا وہ مقام دیتے تھے جو عبدیت و بندگی کے مقام سے بالاتر اور الوہیت کے مقام سے قریب تر ہے اور یہ کھلا ہوا شرک فی الصفات ہے۔ قرآن نے اس کی تردید فرمائی ہے۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (النحل ۱۶:۴۹-۵۰)

''اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں جاندار ہیں اور فرشتے بھی، وہ سرتابی نہیں کرتے، وہ اپنے اوپر رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔''

''تکبر نہیں کرتے، یعنی اپنے تئیں بندگی سے بالاتر نہیں سمجھتے، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اپنے اوپر سے، یعنی قربت حاصل ہونے کے باوجود خدا کے ساحت جلال تک ان میں سے کسی کی رسائی نہیں ہے، بس اوپر سے جو حکم نازل ہوتا ہے اس کی تعمیل کر دیتے ہیں۔ يُؤْمَرُوْنَ عربی زبان میں مجہول کا صیغہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ حکم دینے والے کا مقام ان کی پہنچ سے بالاتر ہے، اس وجہ سے بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس قربت پر فخر کریں اور یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ اب وہ جو چاہیں خدا سے کرا سکتے ہیں، جیسا کہ مشرکین کا ان کے بارہ میں خیال ہے، وہ ہر وقت خدا کی بندگی و اطاعت میں سرگرم اور اس کی خوشنودی اور قربت کے طلب گار رہتے ہیں۔''

يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ (بنی اسرائیل ۱۷:۵۷)

''وہ تو خود ہی اپنے رب کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے۔''

مشرکین اپنے لیے بلا کسی واسطہ کے خدا کی قربت ناممکن خیال کرتے تھے اس وجہ سے ان فرشتوں کو خدا تک رسائی کا وسیلہ بناتے تھے اور ان کی بندگی کرتے تھے اور اس طرح شرک فی اللوازم یا شرک فی العبادت کی بدعت شروع ہوئی، قرآن مجید نے خود ان کی زبان سے ان کی ملائکہ پرستی کی یہی توجیہ پیش کی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ (الزمر ۳۹:۳)

''اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم تو انکی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں۔''

دنیا کی فارغ البالی اور خوش حالی ان فرشتوں کی بندگی کی برکت سمجھتے۔ ان کے خیال میں اولاد ان کی عنایت سے ملتی تھی، چنانچہ قرآن نے ان کے اس خیال کا اظہار کر کے اس کی تردید فرمائی ہے۔

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ (اعراف ۷:۱۹۰-۱۹۱)

''تو جب اللہ ان کو تندرست اولاد دے دیتا ہے تو اس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ اس کے لیے دوسرے شریک ٹھہراتے ہیں، اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔''

اسی طرح روزی، ان کے خیال میں، فرشتوں کی عنایت سے ملتی تھی، قرآن نے ان کے اس گمان کی تردید فرمائی ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ وَ اعۡبُدُوۡہُ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ ؕ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ (العنکبوت ۲۹:۱۷)

''جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو یہ تمہارے لیے رزق پر کوئی اختیار نہیں رکھتے تو اللہ ہی کے پاس رزق کے طالب بنو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کے شکر گزار رہو، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

اہل عرب موت کے بعد کی زندگی اور حساب و کتاب کو اگرچہ مستبعد خیال کرتے تھے، لیکن کہتے تھے کہ بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی پڑا اور حساب و کتاب کی نوبت ہی آئی تو یہ فرشتے جن کو ہم پوجتے ہیں ہماری سفارش کریں گے اور ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے ان کے اس عقیدہ سے ایک طرف خدا کی صفت علم و عدل اور حکمت کا انکار لازم آتا ہے جو کفر ہے۔[1] اور دوسری طرف یہ خدا کی صفتوں میں غیر اللہ کو شریک کرنا ہے جو کھلا ہوا شرک ہے قرآن نے اس کی مختلف پہلوؤں سے تردید کی ہے ہم بعض آیتیں یہاں نقل کرتے ہیں جن سے ان کے عقیدہ کا اصلی پہلو بھی واضح ہو جائے گا اور قرآن نے جس پہلو سے اس کی تردید کی ہے، وہ بھی سامنے آجائے گا۔

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۶﴾ اَمۡ لَکُمۡ کِتٰبٌ فِیۡہِ تَدۡرُسُوۡنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَکُمۡ فِیۡہِ لَمَا تَخَیَّرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ اَمۡ لَکُمۡ اَیۡمَانٌ عَلَیۡنَا بَالِغَۃٌ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ اِنَّ لَکُمۡ لَمَا تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۹﴾ سَلۡہُمۡ اَیُّہُمۡ بِذٰلِکَ زَعِیۡمٌ ﴿۴۰﴾ اَمۡ لَہُمۡ شُرَکَآءُ ۚ فَلۡیَاۡتُوۡا بِشُرَکَآئِہِمۡ اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ

(القلم ۶۸:۳۵-۴۱)

''کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے! تمہیں کیا ہوا ہے کیسا فیصلہ کرتے

---

[1] اس عقیدہ سے خدا کی صفات علم، عدل و حکمت کا انکار کس طرح لازم آتا ہے؟ اس سوال کا تفصیلی جواب ''حقیقت توحید'' میں ملے گا۔ ہم یہاں صرف بالا جمال اہل عرب کے شرکیہ عقائد کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہو! کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو، اس میں تمہارے لیے وہی کچھ ہے جو تم پسند کرو گے! کیا تمہارے لیے ہمارے اوپر قسمیں ہیں قیامت تک باقی رہنے والی کہ تمہارے لیے وہی کچھ ہے جو تم فیصلہ کرو گے! ان سے پوچھو ان میں سے کون اس کا ضامن بنتا ہے؟ کیا ان کے کچھ شرکاء ہیں؟ تو وہ لائیں اپنے شریکوں کو اگر وہ سچے ہوں!''

سورۂ نجم میں ان فرشتوں کے نام بھی قرآن نے گنا دیے ہیں جنکی شفاعت پر اہل عرب کو بڑا اعتماد تھا اور ایک دوسرے پہلو سے ان کے شریک خدا یا شفیع ہونے کی تردید بھی کر دی ہے۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿٢٠﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿٢٢﴾ اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (النجم ۵۳:۱۹-۲۳)

''بھلا کبھی غور کیا ہے لات اور عزّٰی اور منات پر جو تیسری اور درجہ کے اعتبار سے دوسری ہے! تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اس کے لیے بیٹیاں! یہ تو بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری، یہ لوگ محض گمان اور نفس کی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے نہایت واضح ہدایت آ چکی ہے۔''

ان آیتوں میں لات، منوۃ اور عزّیٰ کا جو ذکر آیا ہے، یہ تینوں فرشتوں کے بت تھے اور تینوں کے نام عورتوں کے نام پر تھے ان کی شفاعت پر مشرکین کو بڑا اعتماد تھا، اہل عرب ان کا طواف کرتے تھے اور طواف کے وقت یہ الفاظ دہراتے تھے تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی، (یہ بلند مرتبہ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے) آگے کی آیات میں ان کے اسی خیال کی تردید ہو رہی ہے:

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿٢٤﴾ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى ﴿٢٥﴾ وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي

السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْضٰۤی ﴿۲۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِیَةَ الْاُنْثٰی (النجم ۵۳:۲۴-۲۷)

''کیا انسان وہ سب کچھ پالے گا جو وہ تمنا رکھتا ہے! سو یاد رکھو کہ آخرت اور دنیا سب خدا ہی کے اختیار میں ہے اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش ذرا بھی کام آنے والی نہیں مگر بعد اس کے کہ اللہ اجازت دے جس کو چاہے اور جس کے لیے پسند کرے جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہی نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں۔''

اس کے بعد شفاعت کے ابطال کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ شفاعت نیک کو بد اور بد کو نیک بنا دے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے عدل اور حکمت کے بالکل خلاف ہے ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پائے گا، خدا کی رحمت کے مستحق وہی ٹھہریں گے جو بھلے کام کریں گے، گناہوں اور بدکاریوں سے بچیں گے، ہاں کبھی لغزش اور خواہش نفس کے غلبہ سے کسی بدی میں آلودہ ہو جائیں گے تو یہ علیحدہ چیز ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دامن بہت وسیع ہے، وہ بڑی برائیوں سے بچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۙ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی ﴿۳۱﴾ الَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ (النجم ۵۳:۳۱-۳۲)

''اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنہوں نے بُرے کام کیے ہیں ان کے کیے کا اور بدلہ دے ان لوگوں کو جنہوں نے اچھے کام کیے ہیں اچھا یعنی ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے رہے مگر یہ کہ کبھی کسی برائی پر پاؤں پڑ گئے، سو تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے۔''

جن فرشتوں سے یہ امیدیں وابستہ کی گئیں لازماً وہ اس درجہ کی محبت کے بھی سزاوار

قرار پائے جو صفات الٰہی کے مقتضیات ولوازم اور اللہ تعالیٰ کے خاص حقوق میں سے ہے اور جو اسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔ قرآن مجید ان کے اس شرک فی الحقوق کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ (البقرہ ۲:۱۶۵)

''اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے، لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب کہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے۔''

يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ (جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے) کا مطلب یہ ہے کہ ان فرشتوں کے ساتھ ان کی یہ محبت مستقل محبت ہے، خدا کی محبت کے تابع نہیں، اور جو محبت خدا کی محبت کے تابع نہ ہو وہ شرک ہے، اہل ایمان کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی ہوتی ہے کہ دوسری تمام محبتیں اس کے تابع ہو جاتی ہیں جہاں کوئی محبت خدا کی محبت سے متصادم ہوئی انہوں نے فوراً اس سے استعفا دے دیا، یہ نہیں ہے کہ اس کی خاطر خدا اور اس کی شریعت کو نظر انداز کر بیٹھے، یہی مفہوم ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ کا۔

ان تمام امیدوں اور نیاز مندیوں کے بعد ان فرشتوں کی نسبت یہ عقیدہ رکھنا بھی لازم ہو گیا کہ وہ ان ساری دعاؤں اور عبادتوں اور اپنی بندگی کرنے والوں کے حالات سے باخبر بھی ہیں، کیونکہ اس کے بغیر ان کی بندگی کرنے اور ان سے محبت کرنے کا فائدہ کیا؟ چنانچہ صفت علم کے اس مفہوم میں وہ شریک ہوئے جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے قرآن نے اس کی تردید کی ہے:

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۝ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (یونس ۱۰:۲۸-۳۰)

''اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے پھر ہم شرک کرنے والوں کو حکم دیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی جگہ ٹھہرو، پھر ہم ان کے درمیان تفریق کریں گے اور ان کے شریک کہیں گے، تم ہم کو تو نہیں پوجتے تھے، اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے، ہم تمہاری عبادت سے بالکل ہی بے خبر رہے، اس وقت ہر شخص اپنے اس عمل سے دوچار ہوگا جو اس نے کیا ہوگا اور لوگ اپنے مولائے حقیقی کے حضور پیش ہوں گے اور افترا کر کے انہوں نے جو معبود بنائے تھے وہ سب ہوا ہو جائیں گے۔''

۲۔ جنّات پرستی

ملائکہ کی طرح جنّات کو بھی اہل عرب بندگی سے مافوق اور زمرۂ الوہیت سے نسبت رکھنے والی مخلوق خیال کرتے تھے، قرآن نے ان کے اس خیال کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَ لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (الصفت ۳۷:۱۵۸-۱۵۹)

''اور انہوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے اور جنوں کو خوب پتا ہے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔''

اس نسبت بلند کی وجہ سے لازماً خدائی میں یہ جنات بھی شریک قرار دیے گئے۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ (الانعام ۶:۱۰۰)

''اور انہوں نے جنوں میں خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا۔''

ان جنوں کو بالکل اس مفہوم میں نافع وضار خیال کیا جانے لگا جس مفہوم میں خدا کو نافع وضار خیال کیا جانا چاہیے، یعنی یہ سمجھا جانے لگا کہ اگر یہ کسی کو نقصان پہنچائیں تو کوئی ان کو روکنے والا نہیں اور اگر کسی کو نفع پہنچائیں تو کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض اوقات ان کے جوش غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انسانی جانوں کی قربانی کی جانے لگی جو تذلل اور نیاز کا آخری درجہ ہے اور خدا کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس کا حقدار ہو سکے، اگرچہ اس نے بھی بندوں سے اس صورت میں اس کا مطالبہ نہیں کیا ہے جس صورت میں مشرکین اپنے ان شرکاء کے لیے جانی قربانیاں پیش کرتے تھے، قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے،

زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ (الانعام ۶:۱۳۷)

''بہت سے مشرکین کی نظر میں ان کے شرکاء نے ان کی اولاد کے قتل کو ایک مستحسن فعل بنا دیا ہے۔''

مصائب وآفات میں ان کی دہائی دی جاتی اور پناہ بھی پکڑی جاتی ہے۔

وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن ۷۲:۶)

''اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو جنوں میں سے بعض کی دہائی دیتے رہے ہیں۔''

زمرۂ الوہیت میں سے خیال کیے جانے کی وجہ سے یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک ہے، وہاں سے غیب کی خبریں لاتے ہیں اور کاہنوں کو پہنچاتے ہیں، چنانچہ کہانت کے بازار کی ساری رونق انہیں کے دم سے تھی، قرآن نے اس کی تردید کی۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ ۝ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ

شِهَابٌ ثَاقِبٌ (الصفت ۳۷:۶-۱۰)

''بے شک ہم ہی نے سجایا ہے سماء دنیا کو ستاروں کی زینت سے اور اس کو محفوظ کیا ہے اچھی طرح ہر سرکش شیطان کی دراندازی سے اور وہ ملاء اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگانے پاتے اور وہ ہر جانب سے دھتکارے جاتے ہیں، کھدیڑنے کے لیے اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے مگر یہ کہ کوئی اچک لے کوئی بات تو ایک دمکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔''

غیب دانی کے شوق میں کاہنوں نے ان سے تعلق پیدا کیا اور اس راستہ سے ایک خلق کثیر کو انہوں نے سفلی علوم کے فتنوں میں مبتلا کر دیا اور جنوں کی پرستش شروع ہوگئی۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ (الانعام ۶:۱۲۸)

''اے جنوں کے گروہ، تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا۔''

یہ کاہن لوگ عبدیت و نیاز کے تمام لوازم ان کے لیے پورے کرتے اور غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے ان کا مراقبہ کرتے اور پھر جاہل عوام غیب کی باتیں معلوم کرنے کے شوق میں جب ان کے پاس آتے تو ان کی جھوٹی سچی باتیں بتا کر ان کو الو بناتے، قرآن نے ان کی مکاری کا ذکر کیا ہے۔

يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (الشعراء ۲۶:۲۲۳)

''وہ کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔''

قرآن مجید چونکہ مسجّع اور مقفّٰی ہے اور کاہنوں کا کلام بھی مسجّع اور مقفّٰی ہوتا تھا، نیز قرآن مجید میں پیشین گوئیاں اور کاہنوں کے کلام میں بھی پیشین گوئیاں ہوتی تھیں، اس وجہ سے اس ظاہری مشابہت کی بنا پر ابتدائے نبوت میں قریش نے طعنہ دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کاہن ہیں اور یہ وحی فرشتوں کی لائی ہوئی وحی نہیں ہے بلکہ جس طرح کاہنوں پر جنات وحی لاتے ہیں اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جنات وحی لاتے ہیں قرآن نے اس کی

تردید کی۔

وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (الشعراء ۲۶: ۲۱۰-۲۱۲)

''اور اس کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں، نہ یہ ان کے لیے لائق ہے اور نہ یہ ان کے بس کا ہے، وہ سن گن لینے سے معزول کیے جا چکے ہیں۔''

قرآن نے جو پہلا جواب قریش کو دیا ہے، بعینہٖ وہی جواب اس سے پہلے اس طرح کے شبہ کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے معترض فریسیوں کو دیا تھا، فریسیوں نے جب حضرت مسیح علیہ السلام کے پرتاثیر کلام کو سنا اور ان کے معجزوں اور کارناموں کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ لوگ برابر ان کے گرویدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں تو ان کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے اور عوام کو ان سے بدگمان کرنے کے لیے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ انہوں نے بڑے شیطان، بعلز بول کو کسی عمل کے ذریعہ سے اپنے قابو میں کر لیا ہے اور اسی کی مدد سے یہ معجزے دکھاتے ہیں اور رعب جمانے کے لیے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ خدا کی مدد سے کر رہے ہیں۔ انجیل میں ہے۔

''فریسیوں نے سن کر کہا: یہ بدروحوں کے سردار، بعلز بول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو نہیں نکالتا۔ اس نے (مسیح نے) ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا: جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے وہ ویران ہو جاتی ہے، اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی وہ قائم نہ رہے گا، اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا پھر اس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی؟'' (انجیل متی۔ باب ۱۲: ۲۴-۲۶)

قرآن نے بھی ''وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ'' کے الفاظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ وحی جس کا ایک ایک حرف شیطان اور اس کے سارے مقاصد و محبوبات کے بالکل خلاف ہے، شیطان کی مدد سے کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ خود اپنے کاروبار ضلالت کو درہم برہم کرنے کے

لیے ایسا مبارک صحیفۂ ہدایت کیسے نازل کرسکتا ہے؟ اگر وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنی سلطنت خود اپنے ہاتھوں برباد کرڈالی اور آپ اپنا دشمن بن گیا۔

دوسرا ٹکڑا ''وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ'' (اور نہ یہ ان کے بس کا ہے، وہ سن گن لینے سے معزول کیے جا چکے ہیں) اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کا سورۂ صافات والی آیات میں اوپر ذکر آچکا ہے اور جس کا جنات نے خود، سورۂ جن میں اعتراف کیا ہے۔

وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (الجن ۷۲:۹)

''اور ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں کچھ سن گن لینے کو بیٹھا کرتے تھے، اب جو بیٹھے گا تو وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔''

ملاءِ اعلیٰ سے جنات کے اس تعلق کی قرآن نے جگہ جگہ تردید کی ہے اور بار بار یہ بات بیان فرمائی ہے کہ قرآن شیطانی تصرف سے بالکل پاک ہے اور ایسے مواقع پر بالعموم ستاروں کے گرنے، ان کے ٹوٹنے اور ان کے پھینکے جانے کی بطور شہادت قسم بھی کھائی ہے، جس سے شہاب ثاقب کا گرنا اور شیاطین کا دھتکارا جانا مراد ہے۔ سورۂ واقعہ، سورۂ حاقہ، سورۂ تکویر اور سورۂ نجم میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ سورۂ شعراء میں ایک دوسرے پہلو سے اس کی تردید کی ہے، فرمایا کہ پیغمبر پر شیاطین نہیں آسکتے جس طرح مکھی صرف غلیظ اور نجس چیزوں پر بیٹھتی ہے اسی طرح جنات و شیاطین صرف گندی اور نجس روحوں پر ہی اترتے ہیں، وہ خدا کے رسولوں اور نبیوں پر آنے کی جرأت نہیں کرسکتے اور نہ ان کے کلام میں اپنی باتوں کی کوئی ملاوٹ کرسکتے ہیں۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (الشعراء ۲۶:۲۲۱-۲۲۳)

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کن پر اترتے ہیں! وہ لپاٹیوں، بدکاروں پر اترتے ہیں جو

کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔''

۳۔ کواکب پرستی

دنیا کی تقریباً تمام بت پرست قوموں میں سورج اور چاند کی پرستش رائج رہی ہے، اہل عرب بھی ان کو زمرۂ الوہیت میں خیال کرتے تھے۔ قرآن نے اس کی تردید کی:

وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَ النَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (حم السجدہ ۴۱:۳۷)

''اور اسی کی نشانیوں میں سے رات اور دن، سورج اور چاند بھی ہیں نہ سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند بلکہ سجدہ کرو اُس اللہ کو جس نے ان ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے اگر تم اسی کی بندگی کرتے ہو۔''

اہل عرب نکھتروں کی تاثیر کے بھی معتقد تھے، ان کا خیال تھا کہ انواء (نکھتروں) کو زمین کی خوش حالی میں بڑا دخل ہے، بارش انہی کے جود و کرم کا نتیجہ سمجھتے تھے، بارش ہوتی تو کہتے ''مطرنا بنوء کذا ''فلاں نکھتر خوب برسی، اور یہ نسبت ان کے نزدیک مجازی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ فی الحقیقت اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ پانی برسانا نکھتروں کا کام ہے۔

مشہور ستارہ شعریٰ بھی اہل عرب کا معبود تھا، یہ گرمیوں کے زمانہ میں طلوع ہوتا تھا۔ تابط شراً کا شعر ہے:

شامسن فی القرحتیٰ اذاما ذکت الشعری فبردو ظل

(ممدوح) سردیوں میں گرمی پہنچاتا ہے، یہاں تک کہ جب شعریٰ طلوع ہوتا ہے (گرما میں) تو وہ ٹھنڈک اور سایہ بن جاتا ہے۔

عرب میں جاڑوں کا موسم قحط و افلاس کا موسم ہوتا تھا، شمال کی ٹھنڈی ہوائیں اس زمانے میں پورے ملک کی تمام کاروباری سرگرمیوں کو سرد کر دیتی تھیں، اسی وجہ سے اہل عرب جاڑے کے موسم کو ''ایام نحسات'' کہتے تھے۔ آمد و رفت اور تجارت کی چہل

پہل زیادہ تر گرمیوں کے موسم کے ساتھ مخصوص تھی اور چونکہ یہی زمانہ شعریٰ کے طلوع ہونے کا زمانہ ہوتا تھا، اس وجہ سے یہ ساری خیر و برکت اسی کی طرف منسوب ہوتی تھی۔ قرآن نے سورۂ نجم میں اسی وہم کی تردید کی ہے:

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى (النجم ۵۳:۴۸-۴۹)

''اور اسی نے غنی اور سرمایہ دار کیا اور وہی شعریٰ کا بھی رب ہے۔''

اہل عرب کے تصور مذہبی نے ان مختلف عناصر کو جوڑ توڑ کر دیوتاؤں کی ایک بزم (CONSTELLATION OF GODS) سجائی۔ جس میں خدا کی حیثیت ایک عرش والے (ذوالعرش) یا مہادیو کی قرار دی اور ان دیوتاؤں کو مقرّبین بارگاہ اور ارکان سلطنت کی حیثیت بخشی۔ پھر اس تصور میں تشبیہ نے، جو ہمیشہ سے شرک کے نہایت اہم اسباب وعوامل میں سے رہی ہے، رنگ آمیزی کی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح زمین کے ملوک وسلاطین اپنے دور دراز کے علاقوں کا انتظام اپنے حکّام وعمّال کے سپرد کر دیتے ہیں اسی طرح خدائے عرش نشین نے بھی زمین کے معاملات کا انتظام وانصرام ان دیوتاؤں کے سپرد کر چھوڑا ہے، اس نے اپنا تعلق صرف آسمان کے نظم و اہتمام سے رکھا ہے، جس کو دارالسلطنت کی حیثیت حاصل ہے، باقی رہی زمین، تو اس کے معاملات میں اس کی حیثیت بس ایک گوشہ نشین علّۃ العلل کی ہے اس کی عام تدبیر وسیاست سے وہ بذات خود متعلق (IN TOUCH) نہیں ہے یہ تصور ایک تنزیہی تصور ہے جو بعض مشرک اقوام میں پایا جاتا ہے، لیکن یہ تنزیہ ایک طرف تو خدا کی قدرت اور علم کی نفی ہے، دوسری طرف اس سے خدا کی خدائی اور اس کی حاکمیت کی تقسیم لازم آتی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کی تردید فرمائی ہے۔

اس تقسیم سے خدا کی قدرت اور اسکے علم کی جو نفی ہوتی ہے اور اس پر عجز اور ناواقفیت کا جو عیب لگتا ہے اس کی تردید اس طرح فرمائی ہے:

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ (البقرہ۲:۲۵۵)

''اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ زندہ ہے سب کا قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے —— اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں۔''

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ (یونس۱۰:۲-۳)

''بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا، پھر وہ معاملات کا انتظام سنبھالے، عرش پر متمکن ہوا۔''

اس تقسیم سے خدا کی بادشاہی میں بٹوارے کی جو شکل پیدا ہوتی ہے اس کی تردید اس طرح فرمائی ہے:

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ (النحل۱۶:۵۱)

''اور اللہ نے فرمایا کہ دو معبود نہ بنانا، وہ ایک ہی معبود ہے تو مجھی سے ڈرو۔''

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ

(الزخرف۴۳:۸۴)

''اور وہی اکیلا آسمانوں میں بھی خداوند ہے اور وہی زمین میں بھی خداوند ہے اور وہی حقیقی علیم وحکیم ہے۔''

اس تصور کی تردید ان آیات میں بھی ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۴۲)

''کہہ دو کہ اگر کچھ اور اللہ بھی اس کے شریک ہوتے، جیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں، تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی کر دیتے۔''

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء ۲۱:۲۲)

''اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کے رہ جاتے۔''

زمین کے معاملات میں براہ راست متصرف ماننے کی وجہ سے اہل عرب نے ان دیوتاؤں کو عبادت و تعظیم کے ان تمام لوازم کا مستحق ٹھہرایا جو خدا کے لیے مخصوص تھے، خدا کے لیے کعبہ تھا، ان کے لیے بھی الگ الگ استھان اور معبد بنائے گئے، خدا کے لیے حج اور قربانی کے طریقے تھے، ان کے لیے بھی حج اور قربانی کے مراسم اختیار کیے گئے، خدا نے اپنے لیے شعائر اور قربانی و نیاز کے جانور مقرر کیے، مشرکین نے اپنے معبودوں کے لیے بھی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام مخصوص کر دیے۔[1] خدا کے لیے زمین کی پیداوار اور چوپایوں میں سے ایک متعین حصہ تھا، ان کے دیوتا بھی اس حصے کے مستحق ٹھہرے، اور چونکہ زمین کے نظم و اہتمام کے اصلی ذمہ دار، ان کے خیال کے مطابق، یہی تھے اس وجہ سے خدا کے مقابل میں ان کا حق کچھ زیادہ ہی رہا:

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (الانعام ۶:۱۳۷)

''(اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے اس میں انہوں نے اللہ کا ایک حصہ مقرر کیا ہے،

---

[1] بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام، یہ جانوروں کی مختلف قسمیں ہیں جن کو اہل عرب اپنے دیوتاؤں کے نام پر چھوڑتے تھے اور ان کو ہدی کے جانوروں کی طرح مقدس سمجھتے تھے۔

پس کہتے ہیں: یہ حصہ تو اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ حصہ ہمارے شرکاء کا ہے۔ تو جو حصہ ان کے شرکاء کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکاء کو پہنچ سکتا ہے کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں"

"خدا کا حصہ ان کے شرکاء کی طرف منتقل ہو سکتا تھا، لیکن شرکاء کا حصہ خدا کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا کے لیے صرف جانوروں کی قربانی تھی، لیکن شرکاء کے لیے، جیسا کہ اوپر گزرا، بعض حالات میں اولاد تک کی قربانی پیش کی جاتی تھی۔ خدا نے صرف چند چیزیں حرام کی تھیں، لیکن ان دیوتاؤں کے تعلق سے بہت سی چیزیں حرام (TABOO) ہو گئیں۔ خدا وحی والہام نازل کرتا تھا، یہ دیوتا بھی فال کے تیروں کی زبان سے اپنے فیصلے صادر کرنے لگے۔"

خواص یہ ساری نیاز مندیاں ملائکہ، جنات اور کواکب کے لیے بجالاتے تھے، لیکن عوام کو اتنی پرواز بھی نصیب نہیں تھی، وہ مٹی، پتھر اور لکڑی وغیرہ کے بنے ہوئے بتوں ہی کو اصل کارفرما مانتے تھے، اسی وجہ سے قرآن نے بت پرستی کی تردید میں خواص و عوام دونوں کی ذہنیت کو سامنے رکھا۔ مثلاً سورۂ اعراف میں پہلے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (الاعراف ۷: ۱۹۴)

"جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو یہ تو تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس ان کو پکارو، دیکھو، وہ تمہیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔"

پھر فرمایا:

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا (الاعراف ۷: ۱۹۵)

"کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، کیا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔"

۴۔ آباء پرستی

دیوتاؤں کی اس بزم میں انہوں نے اپنے آباء واجداد میں سے ان بزرگوں کو جگہ دی جن کے مذہبی تقدس کی روایات ان میں پھیلی ہوئی تھیں، ان کی قبریں اور ان کے آثار حصول برکت وقبولیت دعا کے مرکز بنتے بنتے بالآخر معبد بن گئے اور آہستہ آہستہ ان کے متعلق بھی انہوں نے اسی طرح کے عقائد وتصورات قائم کر لیے جس طرح کے عقائد وتصورات انہوں نے جنات اور ملائکہ سے متعلق قائم کر لیے تھے اور جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید فرمائی ہے:

وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ۚ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ ۙ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (النحل ۱۶:۲۰-۲۱)

''اور جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کرتے، وہ تو خود مخلوق ہیں، مردہ غیر زندہ، اور ان کو احساس بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

اس آباء پرستی کی سب سے زیادہ منحوس شکل یہ تھی کہ آباء واجداد کے رواج اور چلن کو انہوں نے دین اور شریعت کی حیثیت دے دی، چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں سب سے زیادہ قومی محرک ان کا یہی آباء پرستی کا خبط تھا جب ان کو اللہ کے رستہ پر چلنے کی دعوت دی جاتی اور خدا کے احکام وقوانین بتائے جاتے تو کہتے: کیا ایک مجنون شاعر کے کہنے سے ہم اپنے آباء واجداد کا طریقہ چھوڑ دیں؟ یہ نہیں ہوسکتا:

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ (المائدہ ۵:۱۰۴)

''اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف آؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانتے رہے ہوں، نہ ہدایت پر رہے ہیں؟''

اس آیت کے آخری حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ دادا کا چلن اس اعتبار سے تو اچھی چیز ہے کہ طبیعت کو اس سے انس اور لگاؤ ہوتا ہے، لیکن کسی چلن کی اچھائی کے لیے مجرد اتنی بات کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ آباء واجداد سے چلا آ رہا ہے۔ اس کے متعلق سب سے مقدم سوال یہ ہے کہ وہ عقل کے خلاف تو نہیں ہے، فطرت انسانی سے بعید تو نہیں ہے، اخلاق کے منافی تو نہیں ہے بالا جمال یہ کہ خدا کے بتائے ہوئے طریقہ سے الگ تو نہیں ہے؟ اگر ان کسوٹیوں پر وہ صحیح اتر جائے تو بے شک وہ صحیح ہے اور آباء واجداد کا طریقہ ہونا اس کی صحت کے لیے ایک مزید سفارش ہے اور اگر ان کسوٹیوں پر وہ کھوٹا ثابت ہو جائے تو وہ باطل ہے اور کسی باطل کا موروثی ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

اس معاملہ میں دنیا ہمیشہ سے افراط وتفریط میں مبتلا رہی ہے، جاہلیت قدیمہ کا نظریہ تو، جیسا کہ اوپر گزرا، یہ تھا کہ آباء واجداد کا طریقہ بہر صورت حق ہے، اس کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ آباء اجداد سے چلا آ رہا ہے، جاہلیت جدیدہ اس معاملہ میں جو نقطہ نظر رکھتی ہے اس کی بہترین ترجمانی مشہور شاعر ٹینی سن کے لفظوں میں یوں کی جا سکتی ہے کہ ''اگر بہتر سے بہتر چلن بھی ہمیشہ باقی رہے تو دنیا کو بگاڑ ڈالے۔'' یہ دونوں راہیں افراط وتفریط کی راہیں ہیں ایک کی بنا تقلید اعمیٰ پر ہے، جو عقل سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے، دوسری کی بنا خیرہ سری اور بد دماغی پر ہے، جو عقل کو اس کی حد سے بڑھانے کا نتیجہ ہے، ایک شرک وبت پرستی کی ایک خاص قسم آباء پرستی (ANCESTOR WORSHIP) کی طرف رہبری کرتی ہے، دوسری الحاد وزندقہ کی طرف لے جاتی ہے جو خود پرستی کا دروازہ ہے اور ان دونوں ہی راہوں میں انسان خدا پرستی کی حقیقت سے محروم اور عاقبت بینی کی ذمہ داریوں سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی عقل وتمیز پر مہر لگا کر چوپایوں کے گلہ میں داخل ہو جائے تو یہ بات بھی جائز نہیں ہو سکتی کہ ایک راستہ کی غلطی اور دوسرے کی صحت کا فیصلہ کیے بغیر وہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے پر چل کھڑا ہو۔

ان دونوں راہوں میں انسان شیطان کے نقش قدم کی پیروی کا مجرم ہے، عقل وفطرت کا راستہ وہ ہے جس کی شہادت دنیا کے اچھے انسانوں اور انبیاء علیہم السلام کی قبل بعثت کی

زندگیوں سے ملتی ہے، ان کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جونہی سن رشد کی کرنیں ان پر چمکیں انہوں نے سب سے پہلے اپنے اس ذہنی ورثہ کا جائزہ لیا جو انہیں آباء واجداد سے پہنچا تھا، اور اس سے جو چیز بھی انہیں عقل وفطرت سے متناقض نظر آئی اس کو انہوں نے بے درنگ چھوڑ دیا۔ اس راہ میں انہیں خلق کی طرف سے بے شمار مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں، لیکن اس کی انہوں نے کوئی پروا نہیں کی، یہی لوگ نوع انسانی کے گل سر سبد تھے اور اپنے اس جوہر کی وجہ سے حق سے مستفید ہونے میں ہمیشہ سب سے آگے رہے۔ جس طرح سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی کرنیں سب سے پہلے اونچی منڈیروں ہی پر چمکتی ہیں، اسی طرح جب کبھی دنیا میں آفتاب حق طلوع ہوا انہی کے دل ودماغ اس سے سب سے پہلے نورانی ہوئے۔ اس کی ایک عمدہ مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۝ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ (یوسف ۱۲: ۳۷-۳۸)

''میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے یہی لوگ منکر ہیں اور میں نے اپنے بزرگوں، ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق معلوم ہے کہ ظاہر میں نہ انہوں نے کسی مذہب کو اختیار کیا اور نہ کسی مذہب کو ترک کیا، جس مذہب پر پیدا ہوئے تھے روز اوّل سے اپنی حیات پاک کے آخری انفاس تک اسی مذہب پر رہے، نبوت کے بعد اسی مذہب کی ان پر وحی ہوئی، مصر میں انہیں قبطیوں کے مذہب سے سابقہ پڑا، لیکن ان کا پاک دل ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی نجاستوں سے آلودہ نہیں ہوا، تاہم وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک قوم کے مذہب کو جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتی تھی، چھوڑا اور اپنے آباء واجداد، ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کے مذہب کو اختیار کیا، ظاہر ہے کہ ان کا یہ ترک واختیار عقلی اور باطنی ہے، انہوں نے اپنے آباء واجداد کے مذہب کو محض میراث پدر سمجھ کر نہیں اپنا رکھا تھا،

بلکہ ایک پاکیزہ فطرت اور متقی دل کی تمام کاہشوں اور کاوشوں کے ساتھ اس کی صداقت وحقانیت کو جانچا پرکھا تھا، وہ طریقہ ان کے لیے خود ان کا اپنا انکشاف تھا اس لیے اپنا بن چکا تھا اور ان کے دل کے ریشہ ریشہ میں اترا ہوا تھا۔ اس کی صحت پر ان کی عقل گواہ تھی اور اس کے فطری اور خدائی ہونے پر انکا دل بالکل مطمئن تھا، وہ اس کے ساتھ اس لیے نہیں لگ لیے تھے کہ باپ دادا کی عصبیت میں گرفتار تھے، بلکہ تمام جہان میں اگر ایک متنفس بھی اس راستہ پر نہ ہوتا جب بھی ان کا راستہ وہی ہوتا۔ البتہ یہ اللہ کا ایک مزید فضل تھا کہ وہی راستہ ان کے آباء واجداد کا بھی تھا، اس کی شہادت ان کے مصر کی پرمحن زندگی سے ملتی ہے، آزمائشوں کی کیسی کیسی گھٹائیں امنڈ امنڈ کے آتی ہیں لیکن ان کے قدم کو لغزش نہیں ہوتی بلکہ تاریکی جتنی بڑھتی جاتی ہے ان کا اطمینان اتنا ہی مضبوط ہوتا جاتا ہے اور جتنا ہی ان کو ہلانے کی کوشش کی جاتی ہے ان کے حق میں اتنے ہی زیادہ استوار ہوتے جاتے ہیں، دنیا میں جو لوگ بھی کسی راستہ کو اس نور بصیرت کی رہنمائی میں اختیار کرتے ہیں وہ اس کو فی الحقیقت اختیار کرتے ہیں اس کی تقلید نہیں کرتے، اگرچہ وہ راستہ ان کے آباء واجداد ہی کا راستہ ہو اور ایسے لوگ دوسری راہوں کو جو چھوڑتے ہیں تو درحقیقت 'وہ چھوڑتے ہیں' اگرچہ ایک قدم بھی وہ ان پر چلے نہ ہوں۔ یہی بصیرت واجتہاد روح دین ہے یہ نہ ہو تو تمام ادیان بے جان و بے روح ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ایک شخص کسی حق کو بھی اختیار کرے، مگر اس لیے نہیں کہ وہ حق ہے اور خدا کی طرف سے ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے آباء واجداد کا طریقہ ہے، تو یہ بھی عرب جاہلیت کی اسی آباء پرستی میں داخل ہے، جو شرک ہے۔

۵۔ خود پرستی

دیوتاؤں کی اس بزم میں مشرکین عرب خود بھی شریک تھے، لیکن وحی الٰہی کی تنبیہ سے پہلے جس طرح انہیں اپنے بہت سے دوسرے مشرکانہ اعمال وعقائد کا شعور نہیں تھا اسی طرح

اس چیز کے شعور سے بھی وہ محروم تھے، وہ اپنے تئیں خدا کا بندہ تو کہتے تھے، لیکن بندگی کے مقتضیات ولوازم سے بے خبر تھے، اس وجہ سے حدود بندگی سے تجاوز کر کے حدود الوہیت میں داخل ہو گئے تھے، قرآن نے ان کی اس طرح کی تعدیوں کی جو صورتیں بیان کی ہیں، ہم ان کا بالاجمال ذکر کریں گے، اور یہ بحث نہایت قابل توجہ ہے۔

(ا۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو اپنی عبدیت اور خدا کی خالقیت وربوبیت سے انکار نہیں تھا، لیکن اس کے لوازم، یعنی خدا کی بندگی اور پھر بندگی کے لوازم یعنی تنہا اللہ ہی کی اطاعت میں وہ جادۂ حق سے منحرف تھے وہ اطاعت میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے، عبادت اور بندگی کا مفہوم ان کے ہاں ''پوجا پاٹ'' سے زیادہ نہیں تھا، وہ اس بات میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے کہ عبادت خدا کی ہوتی رہے اور اطاعت اپنی یا کسی اور کی ــــ وہ اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنے نفس، اپنے آباء واجداد اور اپنے سرداروں اور لیڈروں کی خدا کے احکام کے خلاف پیروی کر کے بھی یہی خیال کرتے تھے کہ اس سے اللہ کی بندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، لیکن قرآن نے متنبہ کیا کہ خدا کی عبادت اس کی اطاعت کے بغیر بے معنی ہے۔ خدا کی بندگی کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ صرف اسی کی اطاعت کی جائے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (الزمر ۳۹: ۲-۳)

''بے شک ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف قول فیصل کے ساتھ اتاری ہے تو تم اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ، یاد رکھو کہ اطاعت[1] خالص کا سزاوار اللہ ہی ہے۔''

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں، سب کو نقل کرنے میں طوالت ہے، ان سب کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جو دین نازل کیا تھا اس میں تحریف وتبدل نے بہت سے اختلافات ڈال دیے تھے اور بے شمار بدعتیں داخل کر دی تھیں۔ اس وجہ سے خدا کی

---

[1] دین کے معنی یہاں اطاعت کے ہیں: الدین اطاعۃ وقد دنتہ ودنت لہ اطعتہ۔ قال عمرو بن کلثوم:

وایاما لنا غرّا کراما ـــ عصینا الملک فیھا ان ندینا

خالص عبادت و بندگی کی راہ مسدود ہوگئی تھی۔ ان بدعات کی موجودگی میں جو لوگ بھی عبادت کر رہے تھے وہ خدائے واحد کی عبادت سے محروم تھے، وہ نام تو اللہ کا ضرور لیتے تھے، لیکن ہر قدم پر غیر اللہ کی اطاعت سے دوچار تھے اس کتاب نے یہ اختلافات مٹا دیے اور شریعت کو غیر الٰہی عناصر سے پاک کر دیا۔ یہ حق و باطل کے درمیان ایک قول فیصل کی حیثیت سے نمودار ہوگئی، اب خدا کی اطاعت و بندگی کی سیدھی راہ باز ہے، پس اسی کی عبادت کرو تنہا اسی کی اطاعت کرتے ہوئے یعنی بندگی وہی معتبر ہے جو خالص اطاعت کے ساتھ ہو، اگر محض مخصوص اوقات میں خدا کا نام جپ لیا جائے اور اطاعت میں اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کیا جائے، خواہ وہ شریک انسان کا اپنا ہی نفس ہو، تو یہ بندگی نہیں، نمرود کی خدائی ہے جس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا

(الفرقان ۲۵:۴۳)

''بھلا یہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے تم اس کے ذمہ دار ہو گے!''

خدا کی اطاعت کا راستہ یہ ہے کہ اس کے انبیاء کی پیروی کی جائے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء ۴:۸۰)

''اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

یہی وجہ ہے کہ ہر نبی کی دعوت یہ رہی ہے کہ اللہ کی بندگی کرو، اور میری بات مانو:

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَ اَطِيْعُوْنِ (نوح ۷۱:۳)

''کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے حدود کی پابندی کرو اور میری بات مانو۔''

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی عبادت و بندگی کی راہ یہ ہے کہ نبی کی اطاعت کی جائے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے راستہ کی پیروی سے انکار کیا جائے جو اللہ کے راستہ سے منحرف ہیں۔ چنانچہ انبیائے کرام علیہم السلام نے بھی اس کی تصریح فرما دی:

وَ لَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ (الشعراء ۲۶:۱۵۱)

''اور حدود سے گزر جانیوالوں کی بات نہ مانو۔''

ہماری اطاعت کرو ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو جنہوں نے حدود الٰہی سے تجاوز کیا ہے اور خدا کے باغی ہیں۔

توحید کا یہی وہ مقام ہے جہاں موحدین اور مشرکین میں اصلی نزاع برپا ہوتی ہے جب خدا کی عبادت صرف ''پوجا پاٹ'' پر قناعت نہیں کرتی، بلکہ یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ جو خدا کے بندے ہیں وہ صرف خدا ہی کی اطاعت بھی کریں اور اس کی اطاعت کے سوا ہر اس اطاعت کو شرک قرار دیں جو خدا کی اطاعت کے خلاف ہے تو اس بات کو وہ لوگ نہیں برداشت کر سکتے جو خود اپنی خدائی کے دعویدار ہوتے ہیں، علماء اسلام میں سے علامہ ابن تیمیہؒ نے اس بحث پر ''العبودیة'' کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جو نہایت مفید مباحث پر مشتمل ہے اس سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ عبادت صرف چند رسوم کا نام نہیں ہے، بلکہ پورا دین اس کے مفہوم میں داخل ہے اور یہ کہ اطاعت کے بغیر خدا کی عبادت کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

ب۔ اسی بنیاد پر قرآن نے وضع قانون مخصوص اللہ تعالیٰ کا حق قرار دیا اور کسی کے لیے اس میں ادنیٰ شرکت بھی گوارا نہیں فرمائی، چنانچہ اکثر جگہ توحید کے بیان کے ساتھ اس امر کا بھی ذکر کیا کہ کسی شے کو حرام اور کسی چیز کو حلال قرار دینا اللہ تعالیٰ کا حق ہے، وہ ہی بادشاہ ہے اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی رعیت اور اپنی مملکت کے لیے قانون بنائے۔ اس کے قانون کے خلاف قانون سازی توحید کی خلاف ورزی، خطوات شیاطین کی پیروی اور خدا کی عبادت کی نفی ہے، جو شخص اللہ کے قانون کے خلاف قانون بناتا ہے وہ اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتا ہے اور اگر دوسرے کے لیے اس حق کو تسلیم کرتا ہے تو اس کو اللہ کے سوا رب بناتا ہے اور اگر اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو یہ شرک کے ساتھ خدا پر افترا بھی ہے۔ سورۂ بقرہ میں آیات ۱۶۳-۱۷۳ پڑھیے۔ شروع کی پانچ آیتوں میں توحید کا بیان ہے پھر اسی کے ذیل میں یہ آیت آتی ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (البقرہ ۲:۱۶۸)

''اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔''

''شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو'' سے اس کی اس دعوت شرک کی طرف اشارہ ہے جس کا اس نے روز اوّل ہی میں اعلان کر دیا تھا:

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ (النساء ۴:۱۱۹)

''میں ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا، ان کو بھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو بھاؤں گا تو وہ خدا کی بنائی ساخت کو بگاڑیں گے۔''

اس کے بعد شیطان کی دعوت کا اصل مقصد واضح کیا ہے کہ وہ برائی اور بے حیائی کی دعوت دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان خود اپنے جی سے حلال و حرام کرے اور اپنا شارع آپ بنے اور پھر بلا سند اس کو خدا کی طرف منسوب کرے:

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۲:۱۶۹)

''وہ تو بس تمہیں برائی اور بے حیائی کی راہ سوجھائے گا اور اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔''

اس کے بعد فرمایا کہ اگر انسان کو قانون الٰہی کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو باپ دادا کی روایات کی سند لاتا ہے، حالانکہ باپ دادا کی روایت کوئی سند نہیں ہے جب تک ان کے اقوال و اعمال کی بنیاد شرع الٰہی پر نہ ہو، باپ دادا کے طریقہ پر شریعت کی سند کے بغیر جم جانا اپنے آپ کو انسان کی صف سے نکال کر چوپایوں کے گلہ میں داخل کر دینا اور گونگوں،

بہروں اور اندھوں کے زمرہ میں شامل ہو جانا ہے:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (البقرہ ۲:۱۷۰-۱۷۱)

''اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہ ہدایت پر رہے ہوں، ان کافروں کی تمثیل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی سمجھتی ہوں۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، یہ سمجھ نہیں سکتے۔''

پھر فرمایا کہ جو لوگ خدا کی عبادت کے مدّعی ہیں تو اس کی عبادت صرف اس طرح نہیں ہو سکتی کہ عبادت تو اس کی کریں، لیکن حرام و حلال اپنے جی سے کریں، اس کی عبادت کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ وضع قانون اور تشریع کا حق خالص اسی کے لیے تسلیم کریں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (البقرہ ۲:۱۷۲)

''اے ایمان والو، جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اللہ ہی کے شکر گزار بنو اگر تم اس کی بندگی کرنے والے ہو۔''

اسی بنیاد پر اللہ کے ایمان اور اس کی بندگی کے لیے تمام خدائی ادیان میں اس بات کو ایک لازمی شرط قرار دیا گیا ہے کہ زندگی کے معاملات اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق چلائے جائیں اور شریعت کو چھوڑ کر کسی اور چیز کو رہنما نہ بنایا جائے۔ قرآن سابق امتوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے خبر دیتا ہے کہ یہی حکم یہود کو دیا گیا تھا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا

لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ۵:۴۴)

''بے شک ہم ہی نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق خدا کے فرمانبردار انبیاء ربانی علماء اور فقہاء یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے، بوجہ اس کے کہ وہ کتاب الٰہی کے امین اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے کہ لوگوں سے نہ ڈریو مجھی، سے ڈریو اور میرے احکام کو دنیا کی متاع حقیر کے عوض نہ فروخت کیجیو اور جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں تو یہی لوگ کافر ہیں۔''

پھر قرآن مجید خبر دیتا ہے کہ بعینہٖ یہی حکم نصاریٰ کو بھی دیا گیا تھا کہ وہ بھی اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق معاملات زندگی کو چلائیں، ورنہ فاسق ٹھہریں گے:

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ۵:۴۷)

''اور واجب ہے کہ اہل انجیل بھی فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے اس میں اتارا اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔''

پھر بتایا کہ جو حکم ان امتوں کو دیا گیا تھا بعینہٖ وہی حکم مسلمانوں کو بھی دیا جاتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات کو اس کتاب کی راہنمائی میں چلائیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہے:

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ (المائدہ۵:۴۸)

''اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، مصداق اس سے پیشتر سے موجود کتاب کی اور اس کے لیے کسوٹی بنا کر، تو ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا اور اس حق سے ہٹ کر، جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔''

بعینہٖ یہی مضمون اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ، سورۂ انعام کی آیات ۱۳۶ سے لے کر ۱۵۳ تک بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جماعت کی شیرازہ بندی اور تنظیم قانون وشریعت سے ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وضع قانون وشرع کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا جائے جو سب کا خالق اور سب کا بادشاہ ہے اگر اس حق میں دوسرے بھی شریک ہو جائیں اور ہر قوم و جماعت اپنے لیے قانون بنانے کی مجاز ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ بدنظمی، انتشار اور فساد فی الارض ہے:

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الانعام ۶:۱۵۳)

''اور یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور دوسری پگ ڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس کی راہ سے الگ کر دیں، یہ باتیں ہیں جن کی تمہیں ہدایت فرمائی تا کہ اس کے غضب سے بچو۔''

توحید اور تشریع کا یہی تلازم سورۂ نحل کی آیات ۵۴، ۵۵ میں موجود ہے لیکن یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

ج۔ خود پرستی کی ایک نہایت اہم اور عام شکل یہ ہے کہ جو لوگ ایک مدت تک فارغ البالی اور خوش حالی کی زندگی بسر کر چکے ہوتے ہیں اور دولت وثروت اور اکتساب علم وفن کے وسائل پر قابض رہتے چلے آتے ہیں، کچھ عرصہ کے توارث کے بعد، اس حالت امن واطمینان کو وہ اپنا استحقاق ذاتی اور اپنے علم وقابلیت کا ثمرہ سمجھنے لگ جاتے ہیں، یہ ذہنی حالت فرد کی ہو یا جماعت کی بس کی گانٹھ ہے، جس سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں، اس کی تہ میں اتر کر غور کیا جائے تو یہ صریح شرک ہے۔ کیونکہ اس دنیا کے اندر جو کچھ ہے سب کا خالق اللہ ہے تمام وسائل وذرائع اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ان وسائل وذرائع پر ہم اپنے جن اعضاء اور جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعے سے تصرف کرتے ہیں وہ سب بھی خدا ہی کا عطیہ ہیں:

قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (الملک ۶۷:۲۳)

''کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے، پر تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو!''

ہمارے عروج و کمال کا کوئی درجہ، ہمارے علم و فضل کا کوئی مرتبہ اور ہماری عظمت وسطوت کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو ہمیں اس کی بندگی اور غلامی سے بے نیاز کر سکتا ہو، ہم سلیمانؑ و ذوالقرنین ہو کر بھی اس کے آگے ویسے ہی محتاج اور فقیر ہیں جیسے سلمان اور ابوذر ہو کر (رضی اللہ عنھما) احتیاج و افتقار ہماری ایک صفت ذاتی ہے جو کسی حال میں بھی ہم سے جدا نہیں ہو سکتی، خواہ ہم کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائیں اور قوت و سطوت کی کتنی ہی بڑی مقدار فراہم کر لیں۔

عرب جاہلیت میں شرک کی یہ قسم بھی موجود تھی، وہ اپنی خوشحالی اور فارغ البالی کو اپنے علم و تدبر کا نتیجہ اور اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ سمجھتے تھے، آخرت کے اولاً تو قائل نہیں تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی تھے تو اس کے لیے عمل و اطاعت کی کسی سرگرمی کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ جس طرح ہم دنیا میں بہتر حالت میں ہیں اسی طرح آخرت میں بھی بہتر حالت میں رہیں گے۔ یہ بہتر حالت میں رہنا ہمارا ایک ذاتی حق ہے جو کسی حال میں ہم سے چھن نہیں سکتا۔ قرآن نے اسی ذہنی حالت کی تصویر کھینچی ہے:

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۫ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ ؕ بَلْ هِیَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (الزمر ۳۹:۴۹)

''پس جب انسان کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو ہم کو پکارتا ہے، پھر جب ہم اس پر اپنی طرف سے فضل کر دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میری تدبیر کی بدولت حاصل ہوا، بلکہ یہ ایک آزمائش ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔''

یعنی انسان کوئی چیز اپنے علم وقابلیت سے نہیں پاتا، جو کچھ بھی پاتا ہے خدا کے فضل سے پاتا ہے اور اس سے مقصود اس کی آزمائش ہوا کرتی ہے کہ وہ شکر کرتا ہے یا ناشکری، لیکن اکثر اس آزمائش سے ناواقف ہیں اور وہ ناشکری ہی کرتے ہیں اور جو چیز خدا کی عنایت سے ملتی ہے اس کو اپنے علم وقابلیت کا ثمرہ اور اپنا ذاتی استحقاق سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح خدا کی ربوبیت اور رزاقیت میں شریک بن بیٹھتے ہیں۔ یہ چیز استکبار اور فساد فی الارض کی جڑ ہے۔ اسی متکبرانہ ذہنیت کی تصویر دوسری جگہ اس طرح کھینچی ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَ مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ

(حم السجدہ ۴۱:۵۰)

''اور اگر ہم اس کو اپنی رحمت کا مزا چکھا دیتے ہیں، اس تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی ہوتی ہے تو کہتا ہے: یہ تو میرا حق ہی ہے اور میں قیامت کے ہونے کا گمان نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو میرے لیے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے۔''

یہی ذہنیت ہے جس کا ذکر سورۂ مدثر میں ہے:

وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ﴿۱۲﴾ وَّ بَنِيْنَ شُهُوْدًا ۙ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۙ﴿۱۴﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (المدثر ۷۴:۱۲-۱۵)

''اور اس کو بخشا مال فراواں، اور بیٹے دیے حاضر باش، اور اس کے لیے خوب راہ ہموار کی، پھر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کے لیے اور زیادہ کروں گا۔''

آخری ٹکڑے: ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (پھر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اس کے لیے اور زیادہ کروں گا) کا مطلب یہ ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اگر بالفرض خدا کے ہاں جانا ہی ہوا تو مجھے دنیا میں جو کچھ حاصل ہے اس سے زیادہ وہاں حاصل ہوگا، کیونکہ وہ اس تمام عظمت وثروت کو اپنے استحقاق کا نتیجہ سمجھتا ہے، اس کو خدا کی بخشش اور آزمائش نہیں سمجھتا۔

اسی ذہنیت کی تصویر سورۂ معارج میں ہے:

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۝ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۝ كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ (المعارج ۷۰:۳۶-۳۹)

''تو ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ دہنے بائیں سے، تم پر پلے پڑ رہے ہیں گروہ در گروہ! کیا ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ جنت نعیم میں داخل کر لیا جائے! ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں!''

یہ تصویر ہے اس حالت کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت قرآن کے وقت پیش آئی، آخرت میں ارباب اقتدار کی ذلت اور جزاء وسزا کی آیتیں جب آپ سناتے تو قریش کے سرداروں کو سخت چوٹ لگتی، ان کے لیے یہ تصور بہت شاق تھا کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جس میں بلندی اور پستی کی میزان ایمان اور عمل صالح کے ہاتھ میں ہوگی اور ایک غریب سے غریب کسان اور ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور بھی اپنی بندگی اور اطاعت کے صلہ میں بڑے بڑے سرداروں کے لیے قابل رشک ہوگا، وہ جب قرآن کی یہ آیتیں سنتے تو ان کی تردید کرتے اور ان کا مذاق اڑانے کے شوق میں ہر چہار طرف سے آپ پر پل پڑتے اور استحقاق ذاتی کے گھمنڈ میں جو ایک متوارث خوش خالی اور سیادت کا قدرتی نتیجہ ہے، یہ کہتے کے اگر ہم خدا کے ہاں جائیں گے بھی تو وہاں بھی ان کمینوں سے اچھے ہی رہیں گے، ہمیں جو کچھ حاصل ہے ہمارے استحقاق ذاتی کا ثمرہ ہے۔ یہ کسی جگہ بھی ہم سے چھن نہیں سکتا، نہ دنیا میں نہ آخرت میں، ہم پیدا ہی اسی لیے ہوئے ہیں کہ حکومت کریں، عیش و آرام کریں اور لوگوں پر بلند و بالا رہیں، قرآن نے اس کا جواب دیا:

كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ (المعارج ۷۰:۳۹)

''ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں۔''

جس کو وہ جانتے ہیں یعنی بتانے کی ضرورت نہیں ہے اس کی بے حقیقی اور کم قدری ان پر اچھی طرح واضح ہے۔ جس پانی کی ایک بوند کے لیے برتری اور پاکیزگی، اپنے استحقاق

ذاتی وموروثی اور اپنے شرف نسبی وحسبی کا یہ غرور زیب نہیں دیتا اور جس انسان کی یہ تمام توانائیاں اور قوتیں اور تمام قابلیتیں بچپنے اور بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں ۔:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً (الروم ۳۰:۵۴)

"اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانائی سے پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت بخشی، پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا۔"

اس انسان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے تئیں بندگی سے بالاتر، عمل واطاعت سے بے نیاز اور خدا کی خدائی میں حصے دار خیال کرنے لگے یہی حقیقت سورۂ نجم میں نہایت لطیف اسلوب سے بیان ہوئی ہے ۔:

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی ۝ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (النجم ۵۳:۳۱-۳۲)

"اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنہوں نے اچھے کام کیے ہیں اچھا۔ یعنی ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے رہے مگر یہ کہ کبھی کسی برائی پر پاؤں پڑ گئے، سو تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے، وہ تم کو خوب جانتا ہے جب کہ اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں رہے، تو تم اپنے کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ، وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے۔"

اس سے اوپر والی آیت میں ملائکہ کی شفاعت کی تردید تھی اس کے بعد جزاء وسزا کا حق

ہونا بیان کیا اور فرمایا کہ اللہ کے ہاں کی کامیابی صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو کبائر اور فواحش سے بچتے رہیں اور اگر کبھی اس طرح کی گندگی کا کوئی چھینٹا دامن پر پڑ جائے تو توبہ واستغفار کے اشک ندامت سے اس کو دھو ڈالیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو استحقاق ذاتی کے گھمنڈ میں مبتلا ہیں اور اپنے آپ کو بڑی چیز، بلکہ پیدائشی حقدار جنت سمجھ رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا ان کے اس وقت سے بھی واقف ہے جب اس نے ان کو خاک سے پیدا کیا اور اس وقت سے بھی واقف ہے جب وہ پانی کی ایک بوند کی شکل میں اپنی ماؤں کے پیٹوں پڑے اور پھر مضغۂ گوشت اور جنین کی صورت اختیار کی، ایسے ناتواں اور حقیر وجود کے لیے جس کی ابتداء اتنی ناچیز ہے، زیبا نہیں کہ وہ اپنی برتری کے غرور میں مبتلا ہو۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب خدا کی بخشش ہے، ایک ذرّہ بھی اس کی قدرت وقابلیت کا نتیجہ نہیں ہے۔

اسی مشرکانہ ذہنیت کی تصویر سورۂ کہف میں ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿٣٧﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (الکہف ۱۸: ۳۲-۳۸)

''اور ان کو دو شخصوں کی تمثیل سناؤ، ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے، ان کو کھجوروں کی قطار سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی کے قطعات بھی رکھے، دونوں باغ خوب پھل لائے، ان میں ذرا کمی نہیں کی اور ان کے بیچ بیچ میں ہم نے نہر بھی دوڑا دی

اور اس کے پھلوں کا موسم ہوا تو اس نے اپنے ساتھی سے بحث کرتے ہوئے کہا: میں تم سے مال میں بھی زیادہ اور تعداد کے اعتبار سے بھی زیادہ طاقت ور ہوں اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر آفت ڈھا رہا تھا، اس نے کہا کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہو جائے گا، اور میں قیامت کے آنے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو اس سے بھی بہتر مرجع پاؤں گا۔ اس کے ساتھی نے بحث کرتے ہوئے کہا، کیا تم نے اس ذات کا انکار کیا جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر تم کو ایک مرد بنا کر کھڑا کیا، لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔"

یہ ایک مفاخرت کی تصویر ہے جو عرب کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی تھی اور جس کے لیے عربی ادب میں اصطلاحی لفظ "منافرت" ہے۔ اس پر غور کیجیے تو ایک ایسے ذہن کے تمام مفاسد اس میں عریاں ہو گئے ہیں جو استحقاق ذاتی کے گھمنڈ میں مبتلا ہو، اس کے جواب میں دوسرے بندۂ موحد نے بعینہٖ وہی بات کہی ہے جو اوپر سورۂ نجم اور سورۂ معارج والی آیتوں میں گزر چکی ہے۔ یعنی اس کو خلقت اور اس کی اصل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس انسان کی اصل مٹی ہے، جو اپنی ابتدا میں صرف نجس پانی کی ایک بوند ہے، اس کے لیے استحقاق ذاتی کا لفظ بالکل بے معنی ہے اور پھر نہایت خوبی کے ساتھ اس امر کو واضح کیا ہے کہ یہ استکبار اور استحقاق ذاتی کا گھمنڈ درحقیقت شرک ہے۔ جو شخص اس غرور میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدائی میں شریک بناتا ہے اور پھر اپنے آپ کو اس شرک سے بری کیا ہے: لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا)۔ بعد کی آیت میں اس برخود غلط مغرور کے باغ کی تباہی کا ذکر ہے اور اس کی حسرت ان الفاظ میں بیان کی گئی: يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (الکھف ۱۸:۴۲) (اے کاش! میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دولت و ثروت کی چکاچوند باقی رہی آنکھیں بند رہیں، اس وقت تک اپنی قوت و تدبیر پر ناز تھا، اپنی جمعیت و عصبیت پر فخر تھا، اپنے خدم و حشم کی کارفرمائیوں

پر غرور تھا، لیکن جب باغ ویران ہو گیا اور جمعیت وعصبیت کچھ کام آسکی نہ خدم وحشم کچھ کام آسکے: وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا (الکھف ۱۸: ۴۳) (پاس نہ تو کوئی جتھا تھا جو خدا کے مقابلے میں اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود ہی انتقام لینے والا بن سکا۔)

تو ان اصنام کی بے حقیقتی اس پر واضح ہو گئی اور پھر اس نے افسوس کیا کہ ہائے میری کم بختی میں نے ان کو کیوں اپنے پروردگار کا شریک ٹھہرایا!

جن ذہنوں کے اندر یہ گھمنڈ بسا ہوا ہے ان پر مایوسی و دل شکستگی چھا جاتی ہے لیکن جوں ہی حالات بدل جاتے ہیں، سروسامان پھر بہم ہو جاتا ہے، قوت وشوکت کے جلوے پھر نظر آنے لگتے ہیں، نفس کے اندر کی دبی ہوئی خدائی پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ قرآن کے لفظوں میں "فرح فخور" (اکڑنے والے اور فخر کرنے والے) بن کر زمین میں پھر فساد پھیلانے اور خدا کی خدائی کی جگہ خدا کی بندوں سے اپنی خدائی منوانے میں اپنا سارا زور صرف کرنے لگتے ہیں:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ (یونس ۱۰: ۲۲-۲۳)

"وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں ہوائے موافق سے چل رہی ہوتی ہیں اور وہ اس میں مگن ہوتے ہیں کہ دفعتہً ایک باد تند آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم ہلاک ہوئے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں، خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس آفت سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہو کر رہیں گے تو جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے وہ نجات پاتے ہی زمین میں، بلا کسی حق کے، سرکشی کرنے لگتے ہیں۔"

یہ مشرکانہ ذہنیت ہے جس کا ذکر سورۂ قصص میں ہے:

وَ ابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ (القصص ۲۸:۷۷-۷۸)

''اور جو کچھ خدا نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو اور دنیا میں سے اپنے حصہ کو نہ بھولو، اور جس طرح خدا نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو اور زمین میں فساد کے طالب نہ بنو، اللہ تعالیٰ فساد چاہنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اس نے جواب دیا کہ مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم کی بدولت ملا ہے۔''

سورۂ فجر میں ہے:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ

(الفجر ۸۹:۱۵-۱۶)

''لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا خداوند اس کا امتحان کرتا اور اس کو عزت و نعمت بخشتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے اور جب اس کو جانچتا اور رزق میں کمی کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے خداوند نے مجھے ذلیل کر ڈالا۔''

یعنی یا تو یہ سمجھ کر کہ میں لائق عزت ہوں اور مجھے جو کچھ ملا ہے میرے استحقاق کا نتیجہ ہے مغرور و متکبر ہو جاتا ہے اور زمین میں اکڑنے اور فساد پھیلانے لگتا ہے یا بحالت دیگر یہ سمجھ کر کہ خدا نے مجھے بالکل نکما اور ذلیل بنا دیا، ذلیل و نامراد ہو جاتا ہے۔ اور عزت نفس کا وہ جوہر بھی کھو بیٹھتا ہے جو سوسائٹی کے اندر اس کو ایک خود دار اور باوقار انسان کی جگہ دلا سکے، یہ عدم توازن محض اس غلطی کا نتیجہ ہے کہ انسان اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی اور اپنی تدبیر و قابلیت کا ثمرہ خیال کرنے لگتا ہے، یہ تصور ایک مشرکانہ تصور ہے۔ موحدانہ تصور یہ ہے کہ انسان عسر اور یسر، تنگی اور فراخی، دونوں کو خدا کی طرف سے

سمجھے، دونوں میں اپنے لیے آزمائش خیال کرے، فراخی کے متعلق یہ خیال کرے کہ یہ شکر کی آزمائش ہے، تنگی کے متعلق یہ خیال کرے کہ یہ اس کے صبر کا امتحان ہے ان دونوں حالتوں سے ایک بندے کا پورا دین ایمان کی کسوٹی پر جانچا جاتا ہے کیونکہ دین درحقیقت صبر اور شکر ہی کے مجموعہ کا نام ہے، جس شخص کا تصور یہ ہوگا، لازماً اس کا نفس متوازن رہے گا نہ وہ مصائب میں گھبرائے گا، نہ فراخی وکشادگی کے وقتوں میں مغرور ومتکبر ہوگا، وہ جب دشمنوں کے نرغہ میں ہوگا اور اس کے سر کے لیے بڑے بڑے انعاموں کا اعلان ہوگا تو عین اس وقت جب کہ آخری خطرہ بالکل سامنے ہوگا وہ اپنے ایک ہی ساتھی کو ان لفظوں میں تسلی دے گا: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ ۹:۴۰) (تم غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے) اور عین اس وقت جب کہ ہزاروں انسانوں کی دل بادل فوج کے اندر اس پر ایک شہنشاہ اعظم کا دھوکا ہو رہا ہوگا اس کی مقدس پیشانی گھوڑے کی زین پر خدا کے آگے جھکی ہوگی۔ ایسے متوازن نفس کے لیے قرآن نے نفس مطمئنہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔:

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر ۸۹:۲۷-۳۰)

”اے وہ جس کا دل اپنے رب پر جمارہا، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی، مل جا میرے بندوں میں، داخل ہو جا میری بہشت میں۔“

باب ۳

اہل کتاب کا شرک

اہل کتاب کے دو گروہوں کا ذکر قرآن نے کیا ہے: یہود اور نصاریٰ کا، یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے سوا ان تمام اساسات دین کو تسلیم کرتے تھے جن پر ایمان لانے کی دعوت قرآن دیتا تھا، یہاں تک کہ عقیدۂ توحید بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان مسلّم تھا، نہ یہ لوگ اصول کی حد تک اس کے منکر تھے، نہ تورات اور انجیل کی تصریحات کی موجودگی میں اس کا انکار ممکن تھا، لیکن اس مسلّمہ پر ایمان رکھنے کے باوجود وہ بہت سے ایسے اعمال ومعتقدات میں مبتلا تھے جو کفر اور شرک کو مستلزم تھے، قرآن نے اسی مسلّمہ کو اساس بحث قرار دے کر ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے اعمال وعقائد کو تناقض سے پاک کر لیں، یا تو توحید کا انکار کر دیں کہ اس کے لوازم کو تسلیم کرنے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر جس وادی میں چاہیں ٹھوکر کھائیں، یا اس کے لوازم اور مقتضیات کو بھی تسلیم کریں اور اسی چراغ کو لے کر اپنے تمام اعمال وعقائد کا جائزہ لیں اور جو بدعات ومفاسد ان میں، توحید سے بالکل متناقض، پیدا ہو گئے ہیں، ان کو دور کریں۔

یاد ہوگا، عربوں سے بحث کا آغاز اس نقطہ سے ہوا تھا کہ جب آسمان وزمین کا خالق، قوتوں اور قابلیتوں کا موجد، آسمان وزمین کا مدبر خدا ہی ہے اور تمہیں ان مسلمات سے انکار نہیں ہے تو پھر ایسی باتیں کیوں مانتے ہو جو ان تمام مسلّمات کے تار و پود بکھیر دیتی ہیں، بالکل اسی طرح ایک قدم آگے بڑھ کر اہل کتاب سے نفس عقیدۂ توحید کو مرکز قرار دے کر بحث کا آغاز ہوا کہ اگر یہ عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مانا ہوا ہے تو آؤ اسی کسوٹی پر

اپنے کھرے کھوٹے کا امتحان کرلو، فرمایا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران ۳:۶۴)

''کہہ دو! اے اہل کتاب، اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اسکے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی اللہ کی بندگی کرنا، کسی کو اس کا شریک نہ ماننا، کسی کو خدا کے سوا رب نہ ٹھہرانا اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان مسلم تھا، ان میں سے کسی ایک بات سے بھی نہ یہود کو اختلاف تھا نہ نصاریٰ کو۔ لیکن کسی کو رب نہ ماننے کا مفہوم وہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ کسی کو خدا کے سوا رب نہ پکارا جائے ان کے نزدیک خدا کی ربوبیت میں اس بات سے کوئی فرق نہیں آتا تھا کہ جو حقوق وصفات خدا کے لیے مخصوص ہیں ان میں دوسروں کو بھی شریک کر دیا جائے۔ مثلاً تشریع اور قانون سازی اللہ تعالیٰ کے مخصوص اختیارات میں سے ہے، اور کسی کے لیے بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ اس کے اس اختیار میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں ساجھا بٹانے کی جرأت کا مرتکب ہوتا ہے اور اگر ہم خود کسی کے لیے یہ حق تسلیم کرتے ہیں تو گو زبان سے ہم اس کو رب یا خداوند نہ کہیں، لیکن درحقیقت ہم اس کو خدا کی حاکمیت اور ربوبیت میں شریک گردانتے ہیں۔ مگر یہود اور نصاریٰ خدا کے اس حق میں دوسروں کو شریک کرنے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے چنانچہ قرآن نے اسی بنیاد پر یہود و نصاریٰ دونوں ہی کو اس امر کا مجرم قرار دیا کہ یہ اپنے علماء اور فقیہوں کو اللہ کے سوا رب ٹھہراتے ہیں۔:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ

مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (التوبۃ ۹:۳۱)

''انہوں نے اللہ کے سوا اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب بنا ڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انہیں صرف ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔''

اس آیت سے متعلق احادیث میں عدی بن حاتمؓ کا ایک سوال منقول ہے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہود و نصاریٰ اپنے عالموں اور راہبوں کو رب تو نہیں کہتے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان کو وہ حرام کرتے ہیں، تو تم ان کو حرام قرار دے دیتے ہو، اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے ان کو وہ حلال کر دیتے ہیں، تو تم ان کو حلال قرار دے دیتے ہو؟ عدی بن حاتمؓ نے کہا: ہاں یہ بات تو ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فتلک عبادتھم یہی ان کی پرستش ہوئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ عدی بن حاتمؓ کو یہ غلط فہمی تھی کہ جب تک زبان سے کسی کے خداوند ہونے کا اقرار نہ کیا جائے اس وقت تک وہ خدا اور رب نہیں ہوتا اور جب تک کسی کی رسمی عبادت نہ کی جائے اس وقت تک وہ معبود نہیں بنتا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کا ازالہ یوں فرمایا کہ کسی کو خداوند کہو یا نہ کہو، اگر وہ حقوق و اختیارات اس کو دیتے ہو جو خدا کے لیے مخصوص ہیں، تو بغیر اس کے کہ تم زبان سے اس کو رب اور اللہ کہو اس کو رب مان رہے ہو اور بغیر اسکے کہ اس کی پوجا کے رسمی طریقے بجالاؤ اس کی پرستش کر رہے ہو، قانون اور شریعت بنانا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، اس منصب پر تم جس کو سرفراز کر دو وہ خداوند بن جائے گا اور تم اس کے بندے بن جاؤ گے، زبان سے اس کو بندہ کہو یا خدا۔

آیت کی صحیح توجیہ سمجھنے کے لیے یہ تشریح کافی ہے، لیکن اس کی مزید وضاحت کے لیے یہاں چند مفید باتوں کا بیان کرنا ان شاء اللہ بے موقع نہ ہوگا۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے دو شرک بیان ہوئے ہیں: احبار و رہبان کو رب بنانا

اور حضرت مسیحؑ کو رب بنانا، ہم دونوں چیزوں پر بالاجمال گفتگو کریں گے۔

۱۔ احبار پرستی

یہود کے متعلق یہ امر معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی شریعت کی بہت سی باتیں فراموش کر دی تھیں: فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (المائدہ ۵:۱۴) (تو جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے۔) بہت سے مقامات میں تحریف کر ڈالی تھی، مثلاً جہاں بنی اسماعیل کے اندر ایک نبی خاتم علیہ الصلاۃ والسلام کی بعثت یا قبلۂ ابراہیمی یا مقام قربانی وغیرہ کا بیان تھا۔ بہت سے احکام انہوں نے چھپا دیے تھے، بالخصوص جو زنا، سرقہ، قتل نفس وغیرہ کے حدود کے متعلق تھے، بہت سے احکام پر انہوں نے شرعی حیلوں کے پردے ڈال دیے تھے، بہت سے فتوے قانون الٰہی کے بالکل خلاف، محض اغراض دنیوی کے لیے لکھتے تھے، اور پھر ان کے متعلق یہ دعوے کرتے تھے کہ یہ عین تورات کے احکام ہیں، یہ ساری باتیں قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں ظاہر ہے کہ ان کی شریعت کے ان تمام گوشوں میں خدا کی حاکمیت بالکل معدوم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ان کے علماء وفقہاء کے خود ساختہ احکام وقوانین نے لے لی تھی۔

اسی طرح بائیبل ہسٹری اور یہود کے نظام قضا اور طریق قانون سازی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اجتہاد بالکل معدوم تھا۔ قبائل میں جو قاضی مقدمات کے فیصلہ کے لیے مامور تھے وہ نئے مسائل میں، جن کے بارے میں کوئی صریح حکم تورات میں موجود نہ ہوتا، یہ نہیں کرتے تھے کہ تورات کے احکام اور اپنے نبی کے فیصلے سامنے رکھ کر اجتہاد کر لیں، اور اسلام کے اصول کے مطابق خدا کی مرضی سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ معاملہ کو کاہن اعظم کے سامنے پیش کر دیتے۔ کاہن اعظم خدا کی مرضی معلوم کرنے کا ایک کا قدرتی ذریعہ (NATURAL ORGAN) خیال کیا جاتا تھا۔ کاہن اعظم یہ کرتا کہ وہ خیمہ عبادت میں قدس الاقداس کے اندر جاتا، جہاں تابوت ایک

پردہ کے پیچھے رکھا ہوا ہوتا۔ یہ مقام الہام ربانی کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس پر یہواہ ـــــ خدا ـــــ کے احکام الہام ہوتے۔ وہ ان احکام سے لوگوں کو مطلع کرتا اور لوگوں پر ان کی تعمیل واجب ہوتی، بلنچلی اپنی کتاب 'دی تھیوری آف سٹیٹ' (THE THEORY OF STATE) میں مذہبی حکومت (تھیا کریسی) کے باب میں لکھتا ہے۔

قانون الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا، جس کی دو کروبی حفاظت کرتے، اور جس کی تعظیم الہام ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی، تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقداس میں رکھا رہتا تھا اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی، یہیں کاہن اعظم یہواہ ـــــ خدا ـــــ کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔

''قاضی جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے وہ یہ کام خدا کے نام سے انجام دیتے تھے، کیونکہ قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص تھا، اگر کوئی معاملہ ان کے سامنے ایسا آجاتا جس کا فیصلہ ان کے لیے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لیے ضروری ہوتا کہ لاویوں کے ذریعہ سے خدا کی مرضی معلوم کریں۔''

یہ طریقہ ٹھیک بت پرستوں کی نقالی ہے، اور یہود نے اپنے بگاڑ کے زمانہ میں اس کو اختیار کیا، جس طرح مصر، عراق، نینوا وغیرہ کے بت خانوں میں پجاری اور پروہت، کسی اہم ضرورت کے وقت، اپنے معبودوں کے سامنے جا کر ہاتف غیب کی زبان سے، ان معبودوں کی مرضی معلوم کرتے تھے یا جس طرح اہل عرب اپنے معبودوں کے سامنے فال کے تیروں کے ذریعہ سے ان کے احکام اور فیصلے معلوم کرتے تھے اسی طرح یہود نے بھی تابوت کو ایک معبود بنا لیا تھا۔ جس معاملہ میں ان کو مشکل پیش آتی کاہن اعظم تابوت کے سامنے جا کر، خدا کے احکام اور فیصلے معلوم کر لیتا، مجرد تابوت کے سامنے حاضری حصول الہام کے لیے کافی تھی، یہ کاہن معصوم اور ملہم خیال کیے جاتے۔ اس طریقہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نبی لاوی اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبۃ ۹:۳۱) بن بیٹھے اور ان کے ہر قسم کے خیالات واوہام

نے قانون وشریعت کا درجہ حاصل کر لیا۔

نصاریٰ کے ہاں صورت معاملہ اس سے بھی زیادہ بھونڈی ہے، نصاریٰ کی اصلی حیثیت یہود کے ایک اصلاح یافتہ فرقہ کی تھی، نہ کہ ایک مستقل اُمت کی، حضرت مسیح علیہ السلام نے خود فرمایا ہے کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں، بلکہ اس کو پورا کرنے آیا ہوں یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک اس کی ساری باتیں پوری نہ ہولیں ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے ٹل نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کوئی نئی شریعت نہیں دی، بلکہ اپنے پیروؤں کو صرف روح دین کی تعلیم دی اور قوانین وشرائع میں اسی دین کی پیروی کا حکم دیا جو تورات میں موجود تھا، صرف یہود کی بدعات کی حد تک اس میں اصلاح فرمائی۔

نصاریٰ کی ابتدائی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں حضرت مسیح علیہ السلام کے خلفاء کی حیثیت یہی تھی۔ وہ احکام وشرائع میں تمام تر تورات کے متبع تھے، لیکن پال نے مسیحیت کے تمام ظاہر و باطن کو بالکل مسخ کر ڈالا، اس نے نصاریٰ کو ایک مستقل نام اور ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممیز کیا، اور تورات کے احکام کی پابندی صرف بنی اسرائیل کے لیے خاص کر دی، غیر بنی اسرائیل کے لیے تورات کی پابندی منسوخ کر کے شراب اور سور وغیرہ کو جائز قرار دیا، حضرت مسیح علیہ السلام کے سچے خلفاء نے ان مسائل پر اس سے بڑے بڑے مباحثے کیے، لیکن پال کی بدعات رومیوں وغیرہ کے مذاق کو اس قدر اپیل کرنے والی تھیں کہ بالآخر انہیں کو فروغ ہوا۔ اس طرح مسیحیت نے ایک مستقل امت کی حیثیت اختیار کر لی، لیکن ایک ایسی امت کی جو کتاب وشریعت سے محروم ہے کیونکہ انجیل احکام سے بالکل خالی ہے اور تورات کی پیروی سے پال نے ان کو بری کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تمام معاملات زندگی میں نصاریٰ خدا کے بجائے اپنے علماء کی بدعات کے پیرو ہو گئے۔ علماء جو کچھ کہتے وہی خدا کا حکم بن جاتا، قسطنطین کے زمانہ سے، جب سلاطین روم کی تلوار نے عیسائیت کی عداوت کی جگہ، اس کی حمایت کا رنگ اختیار کیا، پوپ کی عظمت کا یہ حال ہوا کہ ایک طرف پوپ کے احکام روانہ ہوتے دوسری طرف بادشاہ کا فرمان جاری ہوتا کہ ان احکام کی خدائے

قادر مطلق کے احکام کی حیثیت سے پیروی کی جائے۔ بالآخر یہ لے اس درجہ بڑھی کہ ان مقدس علماء کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ یہ زمین پر جو باندھتے وہ آسمان پر بھی باندھا جاتا اور یہ زمین پر جو کھولتے وہ آسمان پر بھی کھولا جاتا، دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اللہ کے احکام کے پیرو نہیں تھے، بلکہ العیاذ باللہ خدا خود ان کے احکام کی تعمیل کرتا تھا۔

۲۔ حضرت مسیحؑ کو رب بنانا

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی رب بنا لیا۔ عیسائیوں کے علم کلام اور مذہبی مباحثات کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فتنہ کا بانی بھی پال ہی ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد جیسا کہ معلوم ہے، غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے، برعکس اس کے پال یونانی فلسفہ اور یونانی تصوف کا ماہر تھا، اس نے انجیل کی شرح ایک نیے رنگ سے پیش کی اور دعویٰ کیا کہ میرے لیے مسیح علیہ السلام کے ان پڑھ شاگردوں کے الفاظ کی پیروی ضروری نہیں ہے جو حقائق و رموز کے سمجھنے سے بالکل قاصر تھے، بلکہ میرا علم براہ راست بطریق مکاشفہ خود مسیح علیہ السلام سے ماخوذ ہے۔ لطف یہ ہے کہ پال عبرانی زبان سے، جو انجیل کی اصل زبان تھی، بالکل ناواقف تھا، اس کا تعلق انجیل کی اصل زبان کے ساتھ وہی تھا جو ایک عجمی جاہل کا قرآن کی زبان کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ جس طرح اسلام کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ دین میں بدعات کے فتنے بیشتر ان عجمیوں کی بدولت اٹھے جو قرآن و حدیث کی اصل زبان سے عموماً ناواقف تھے اور ساتھ ہی ان کے دماغ عجمی فلسفہ و تصوف سے مسموم تھے اسی طرح پال نے جو انجیل کی اصل زبان سے ناواقف اور یونانی فلسفہ و تصوف کا ماہر تھا انجیل اور نصرانیت کا بالکل ہیولا ہی بدل ڈالا۔ اس پر باطنیت (GNOSTICISM) کا رنگ غالب تھا اور اس کی تمام سرگرمیوں میں جو چیز اصل محرک کی حیثیت سے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو رومیوں کے اندر عیسائیت کو مقبول بنائے، اس ذوق اور اس محرک کے ساتھ قدرۃً اس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی اصلی زندگی اور ان کی واقعی تعلیمات سے کوئی دلچسپی

نہیں ہوسکتی تھی، اس کی رغبت کی چیزیں وہی ہوسکتی تھیں جو اس کے فلسفہ باطنیت کے ساتھ میل رکھتی ہوں اور جن کو آسانی کے ساتھ رومی متیھالوجی سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ چنانچہ اس کی ساری بدعتوں کے اندر اس کا یہ ذوق ابھرا ہوا نظر آتا ہے لیکن ہم یہاں صرف الوہیت مسیح کی بدعت کی کسی قدر وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

انجیل میں مسیح علیہ السلام کے لیے بیٹے (ابن) اور کلمۃ اللہ اور خدا کے لیے باپ (اب) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ساتھ ہی جگہ جگہ ان کو ابن آدم بھی کہا گیا ہے، اور توحید کی بھی نہایت واضح لفظوں میں تعلیم دی گئی ہے، مسیح علیہ السلام کے سچے شاگردوں کو ان باتوں کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آئی، عبرانی زبان میں ''ابن'' کا لفظ عبد اور بیٹے کے مفہوم میں مشترک ہے، اسی طرح ''اب'' کا لفظ باپ اور رب کے معانی میں مشترک ہے، ان کو نہ ابن کے لفظ سے کوئی دھوکا ہوسکتا تھا نہ اب کے لفظ سے وہ بے تکلف ابن اللہ کا مفہوم عبداللہ اور ابی کا مفہوم ربی سمجھتے تھے، اور بالفرض لفظ کے اشتراک سے، اگر کوئی ابہام بھی پیدا ہوسکتا تھا تو توحید کی واضح تعلیمات اس کو دور کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اہل حق کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ مشتبہ چیزوں پر عقائد کی بنیاد نہیں رکھتے، بلکہ ان کی تاویل واضح تعلیمات اور قطعی اصولوں کی روشنی میں کرتے ہیں۔ لیکن پال کے لیے انجیل کے انہی چند الفاظ نے تاویل بازی اور فتنہ سازی کا دروازہ کھول دیا، پال کا تمام تر ماخذ عبرانی سے ناواقفیت کی وجہ سے یونانی انجیلیں تھیں یونانی میں آکر ''اب'' اور ''ابن'' کے لفظ اپنے اس مفہوم سے بالکل علیحدہ ہوگئے تھے، جن مفہوموں میں وہ عبرانی میں مستعمل تھے۔ یونانی میں صریحاً وہ باپ اور بیٹے کے مفہوم میں ہوگئے تھے، یہیں سے پال کے مذاق باطنیت کو غذا ملی۔ مسیح کو کلمۃ اللہ بھی کہا گیا تھا، اسی کو اساس قرار دے کر اس نے یہ فلسفہ تراشا کہ کلمہ (LOGOS) ایک برتر تخلیقی روح کائنات (WORLD POWER) ہے، اور مسیح علیہ السلام اس برتر تخلیقی روح کائنات کا مظہر (INCARNATION) ہیں، بس یہیں سے مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کی بدعت چل پڑی۔

پال ۶۴ء میں مرا ہے، اس وقت سے لے کر چوتھی صدی کے اوائل تک اس مسئلہ پر عیسائیوں کے درمیان جو ہنگامے برپا ہوئے اور اس بنیاد پر جو فرقے اٹھے، ان کی تفصیل طولانی ہے لیکن اس عہد کی تاریخ کے طالب علم کو تین فرقے نمایاں طور پر نظر آئیں گے:

۱۔ آریوسی (ARIANS) یہ آریوس (ARIUS) کے پیرو تھے اور مسیح علیہ السلام کو مخلوق مانتے تھے۔

۲۔ سابیلی (SABELLIANS) یہ لوگ حلول کے قائل تھے اور مسیح علیہ السلام کو خدا کا ایک اوتار یا اس کا ایک رخ (ASPECT) کہتے تھے، ان کے نزدیک خدا ہی خالق، منجی اور معزی سب کچھ تھا، جس طرح ایک ہی شخص باپ، مربی اور مہمان سب کچھ ہو سکتا ہے۔

۳۔ تثلیثی ان کا لیڈر (ATHANSIOS) تھا، یہ لوگ عقیدۂ تثلیث کے داعی تھے، ان فرقوں میں سے آریوسی فرقہ صحیح نصرانیت کے بقایائے صالحہ میں سے تھا، اگرچہ دوسرے فرقوں کے دباؤ اور رجحان عام کے اثر سے یہ لوگ بھی بعد میں حضرت مسیحؑ کو مقام بشریت سے کچھ بالاتر خیال کرنے لگ گئے تھے، لیکن تثلیث یا حلول کی تردید میں اس فرقہ کی کوششیں بے نظیر ہیں تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں ایک خاص واقعہ نے مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور عبدیت کے متعلق عیسائیوں کے تمام فرقوں کو بری طرح دست وگریبان کر رکھا تھا، اس وقت تک رومی شاہنشہی کے اندر مسیحیت کافی پھیل چکی تھی اور یہ اختلافات سلطنت کے دشمنوں کے لیے سازگار ہو سکتے تھے، اس وجہ سے قسطنطین نے مسیحیت کا قلع قمع کرنے کی وہ پالیسی، جو اس کے پیشرووں نے اختیار کر رکھی تھی، ترک کر کے حمایت مسیحیت کی پالیسی اختیار کی اس کی سب سے پہلے کوشش یہ ہوئی کہ کسی طرح ان نبرد آزما اور متصادم فرقوں میں اتحاد کرائے تاکہ ان اختلافات کی وجہ سے سلطنت کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اس کے لیے سب سے پہلے

۳۱۴ء میں اریس میں اس نے چرچ کی ایک کونسل منعقد کی، لیکن پیش نظر مقصد میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، بالآخر ۳۲۵ء میں اس کے ایماء سے، چرچ کی ایک جنرل کونسل نیس (NICEA) میں منعقد ہوئی، اور گو وہ خود اس وقت تک باضابطہ عیسائی نہیں ہوا تھا، لیکن اسی نے کونسل کی صدارت کی، یہ کونسل نہایت اہم تھی، اس میں عیسائیت کے تمام فرقوں اور تمام کلیسوں کے ذمہ دار نمائندے موجود تھے، اصلی معرکہ آریوسی فرقہ اور الوہیت مسیح کے معتقدین کے درمیان تھا۔ اس کونسل کی روداد نہایت دلچسپ ہے، جس وقت بوڑھا آریوس مسیح علیہ السلام کے مخلوق ہونے پر تقریر کرنے کھڑا ہوا، ایک شخص نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا اور بہت سے بشپ اور پادری کانوں میں انگلیاں دیے ہوئے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ اس بڈھے پھوس کی کفریات کی تاب نہیں لا سکتے۔ کونسل کی اکثریت آریوس کے خلاف تھی، اس وجہ سے اس کی پارٹی اور اس کے دوسرے حامیوں کو شکست ہوئی، کونسل نے کئی دن کی بحث و تمحیص کے بعد کثرت رائے سے مسیحی عقیدہ مندرجہ ذیل الفاظ میں مرتب کیا جو (NICEAN CREED) کے نام سے موسوم ہوا، اور مسیحی عقائد کے باب میں چوتھی صدی سے لے کر آج تک مسلّم اور سب سے اہم دستاویز ہے:

"ہم ایک خدا پر ایمان لاتے ہیں جو باپ ہے اور قادر مطلق، تمام چیزوں کا خالق تمام حاضر و غائب کا، اور ایک خداوند یسوع مسیح پر ایمان لاتے ہیں، ابن اللہ، خدا کا (جنا ہوا) اکلوتا، باپ کے جوہر سے، خداوند خدا، نور النور، عین خدا سے عین خدا، جنا ہوا، بنایا ہوا نہیں، باپ ہی کے جوہر سے، جس نے تمام چیزیں بنائیں آسمان اور زمین میں، جو ہم آدمیوں کے لیے اور ہماری نجات کے لیے اترا، مجسم بشکل انسان، اس نے دکھ اٹھایا، پھر تیسرے دن جی اٹھا اور آسمان پر چڑھ گیا، مُردوں اور زندوں کی عدالت کے لیے پھر آئے گا اور ہم روح القدس پر ایمان لاتے ہیں۔"

''پردہ جو کہتے ہیں کہ پہلے وہ نہ تھا اور جنے جانے سے پہلے وہ معدوم تھا اور وہ عدم سے وجود میں آیا، یا وہ جو کہتے ہیں کہ خدا کا بیٹا دوسری شے یا دوسرے جوہر سے ہے، یا مخلوق ہے یا بشر ہے وہ کیتھولک اور رسولی چرچ کی طرف سے مردود ہیں۔''

نیس کی کونسل کے بعد سے یہی عقیدہ مسیحی دنیا کا اصلی عقیدہ ہے اس میں آریوس اور اس کے ساتھیوں کی علانیہ تکفیر کر دی گئی ہے، اس کونسل کے بعد سے یہ صرف چرچ ہی کا نہیں، بلکہ سٹیٹ کا بھی مذہب بن گیا اور اس کی تائید کے لیے حکومت کی تلوار بھی بے نیام ہوگئی، اس وجہ سے آریوس کے بہت سے ساتھیوں نے بھی اس کی تائید ہی میں امان دیکھی۔

کس قدر حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ جن عیسائیوں نے پوری تین صدیاں، انسانوں کی خدائی کے انکار کے جرم میں، سلاطین روم کے دل ہلا دینے والے مظالم وشدائد کے شکنجہ میں گزاریں، تلواروں سے قیمہ کیے گئے، آگ میں بھونے گئے، درندوں سے نچوائے گئے، لیکن انسانوں کی خدائی سے برابر انکار کرتے رہے، وہی عیسائی نیس میں جمع ہوکر، ایک کافر بادشاہ کی رہنمائی میں، مسیح کی خدائی کے محضر پر اس عزم وجزم کے ساتھ اپنی مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔

اس کونسل کے بعد کونسلوں پر کونسلیں منعقد ہوئیں اور بعد کی صدیوں میں بھی برابر منعقد ہوتی رہیں، بہت سے جزئی اختلافات بھی پیش آئے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ آریوس کے حامیوں نے زور بھی پکڑ لیا، یہاں تک کہ قسطنطین کے جانشینوں میں سے بھی بعض نے آریوسی عقیدہ اختیار کر لیا، لیکن یہ سب عارضی اور وقتی جزر ومد تھے، مرکزیت اسی عقیدہ کو حاصل رہی جو اوپر مذکور ہوا اور مشہور مورخ گبن کے لفظوں میں اب اسی عقیدہ کے اسرار ورموز کو حل کرنے کا نام مسیحیت رہ گیا ہے۔

عیسائیوں کے یہی وہ مشرکانہ عقائد ہیں جن کی قرآن نے نہایت تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے۔ ہم بعض آیتیں نقل کرتے ہیں۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ

قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ
اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (التوبہ ۹:۳۰)

''اور یہود عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور نصاریٰ مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ یہ سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں یہ ان لوگوں کی بات نقل کر رہے ہیں جو ان سے پہلے مبتلائے کفر ہوئے۔ اللہ ان کو غارت کرے! کہاں ان کی عقل الٹی ہوتی جارہی ہے!۔''

''ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ'' یہ سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں، یعنی اللہ نے نہیں فرمائی ہیں، یہ ان کی اپنی من گھڑت ہے، کتاب الٰہی میں اس کی کوئی سند نہیں ہے يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ یہ ان لوگوں کی بات نقل کر رہے ہیں، جو ان سے پہلے مبتلائے کفر ہوئے یعنی بے سوچے سمجھے اپنے اگلوں کی بات دہراتے ہیں اور قرآن کی توضیح وتشریح کے بعد بھی غور نہیں کرتے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

انہی لوگوں کو مخاطب کر کے دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ

(المائدہ ۵:۷۷)

''کہہ دو: اے اہل کتاب، اپنے دین میں بے جا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو ان سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور جو راہ راست سے بھٹک گئے۔''

یعنی اس تمام فساد کی جڑ آباء پرستی ہے جو ضلالت اگلوں سے چلی آرہی ہے، بے سوچے سمجھے اسی کی پیروی کر رہے ہیں اور اندھی تقلید نے ان کو صحیح تعلیم کی طرف توجہ کرنے سے محروم کر دیا ہے۔

بعض آیات میں ان کے شرک کو کفر سے تعبیر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک حقیقت کے اعتبار سے کفر ہی ہے۔ دین میں صرف خدا کو ماننا معتبر نہیں ہے، بلکہ اس کو جمیع صفات

کمال کے ساتھ ماننا معتبر ہے، اس لیے وہ ماننا جو اس کی تمام صفات کے ساتھ نہ ہو، جیسا کہ مشرکین مانتے ہیں، درحقیقت نہ ماننے کے حکم میں ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (المائدہ ۵:۱۷)

"بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا: اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے، پوچھو: کون اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہے، اگر وہ چاہے کہ ہلاک کر دے مسیح ابن مریم کو، اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں، ان سب کو۔ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کی بادشاہی۔ وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اس آیت میں مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا اوتار مانتے تھے اور چونکہ الوہیت مسیح کی ایک بڑی دلیل ان کی خارق عادت وولادت بھی تھی اس وجہ سے آیت کے آخری حصہ میں اس کی تردید کی ہے اس خیال کی تردید قرآن نے مختلف جگہ مختلف طریقوں سے کی ہے، بعض جگہ ان کو حضرت آدم علیہ السلام سے تشبیہ دی ہے کہ بن باپ کے پیدا ہونا اگر دلیل الوہیت ہے تو آدمؑ کو بھی الٰہ ہونا چاہیے۔ بعض سورتوں میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کو حضرت مسیح علیہ السلام کی سرگزشت کا مقدمہ قرار دیا ہے کہ اگر عام اسباب کے خلاف پیدا ہو جانا خدا بن جانے کی دلیل ہے تو مرد کی پیری اور عورت کے بانجھ پن کے باوجود کسی لڑکے کی ولادت بھی خلاف عادت ہے۔ پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو خدا کیوں نہیں مانتے؟ سورۂ مائدہ میں ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ لَقَدْ

كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ .....مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ (المائدہ ۵:۷۲-۷۵)

"بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ خدا تو یہی مسیح ابن مریم ہے اور حال یہ ہے کہ مسیح نے کہا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، جو کوئی اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا، ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے، حالانکہ نہیں ہے کوئی معبود مگر ایک ہی معبود..... مسیح ابن مریم تو بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں اور ان کی ماں ایک صداقت شعار بندی تھیں دونوں کھانا کھاتے تھے۔"

اس آیت میں حلول اور تثلیث دونوں کے قائلین کی تردید ہے اور ان دونوں فرقوں کے دعوے کے خلاف خود مسیح علیہ السلام کی تعلیم یہ نقل کی گئی ہے کہ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۭ (المائدہ ۵:۷۲) (اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے)۔ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول جو بار بار نقل ہوتا ہے کہ "میرا باپ اور تمہارا باپ" قرآن نے اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر یہ بتائی ہے کہ وہ درحقیقت میرا رب اور تمہارا رب فرماتے تھے، اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ عبرانی میں "اب" کا لفظ باپ اور رب کے مفہوم کے لیے مشترک ہے۔

آیت کے آخر میں ماں اور بیٹے دونوں کے کھانا کھانے کو بھی ان کی بشریت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، کھانا کھانا بشریت کی ایسی دلیل ہے جو بنی اسرائیل میں مسلم تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جو فرشتے آدمیوں کی شکل میں آئے تھے انہوں نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا، لیکن جب انہوں نے کھانے کی طرف التفات نہیں کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فوراً اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ بشر نہیں فرشتے ہیں۔

انجیل لوقا میں ہے کہ ایک مرتبہ خود مسیح علیہ السلام نے بھی کھانا کھا کر اپنے حواریوں کو

اپنی بشریت کا یقین دلایا، اٹھا لیے جانے کے بعد جب وہ دوبارہ اپنے شاگردوں کے پاس آئے تو شاگرد بہت گھبرائے اور ان کی باتیں سن کر ان کو یہ گمان گزرا کہ کوئی روح ان سے باتیں کر رہی ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کے اس وہم کو جس طرح دور کیا اس کی تفصیل انجیل میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔

"اس نے ان سے کہا: تم کیوں گھبراتے ہو؟ اور کس واسطے تمہارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں؟ ۝ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں ہی ہوں، مجھے چھو کر دیکھو کیونکہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی جیسا مجھ میں دیکھتے ہو ۝ اور یہ کہہ کر اس نے انہیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا: کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ ۝ انہوں نے اسے بھونی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا اس نے لے کر ان کے روبرو کھایا۔" ۝ (انجیل لوقا۔ باب ۲۴: ۳۹-۴۳)

اسی سلسلہ میں قرآن مجید کی وہ عظیم سورہ بھی پڑھ لینی چاہیے جو نصاریٰ کی مشرکانہ ضلالتوں کی سب سے زیادہ جامع تردید ہے، یعنی سورۂ اخلاص:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝٣ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤ (الاخلاص ۱۱۲: ۱-۴)

"کہہ دو: وہ اللہ سب سے الگ ہے، اللہ سب کے ساتھ ہے، نہ وہ کسی کا باپ اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا کفو۔"

اس سورہ کے ایک ایک لفظ کا صحیح وزن سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ اوپر عیسیہ کی کونسل کا مرتب کیا ہوا مسیحی عقیدہ، جو ہم نقل کر آئے ہیں، اسکے الفاظ پر غور کر کے ایک مرتبہ اور پڑھ لیجیے، اس کے تقابل سے اندازہ ہو سکے گا کہ یہ سورہ اس عقیدۂ ضلالت کی ایک ایک اصل کو کس طرح ڈھا رہی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ میں نصاریٰ کو اس سورہ سے اس قدر چڑ رہی ہے کہ اگر وہ کسی کو اپنے مذہب میں داخل کرتے تھے تو اس سے، "نعوذ باللہ"

اس خدا پر لعنت کرواتے تھے جس کی صفت اس سورہ میں بیان کی گئی ہے۔

یہاں تک احبار و رہبان اور حضرت مسیح علیہ السلام کو رب بنانے کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، لیکن قرآن نے اہل کتاب کو بعض دوسرے اقسام شرک کا بھی مجرم قرار دیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (النساء، ۴: ۴۷-۵۱)

''اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی، اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے، مصداق ان پیشین گوئیوں کے جو خود تمہارے پاس موجود ہیں، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو ان کے پیچھے کی جانب الٹ دیں یا ان پر بھی اسی طرح لعنت کر دیں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کر دی اور خدا کی بات شدنی ہے، اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس کے سوا جو کچھ ہے اس کو جس کے لیے چاہے گا، بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں! بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، دیکھو، یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کے لیے تو یہی کافی ہے، ذرا ان کو دیکھو جنہیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا، یہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ

ہدایت پر تو یہ ہیں۔''

ان آیات میں اہل کتاب کے لیے قرآن پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ یہ دھمکی بھی ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو مستحق ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چہرے مسخ کر دے اور جس طرح سبت کی حرمت برباد کرنے والوں پر لعنت کی گئی اسی طرح ان پر بھی لعنت کر دی جائے، آنکھ، کان، دماغ، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ نے فائدہ اٹھانے کے لیے بخشی ہیں۔ اگر کوئی قوم ان چیزوں کو رکھ کر ان سے فائدہ نہیں اٹھاتی اور خدا کی آیتیں نہ اس کو دکھائی ہی دیتی ہیں نہ سنائی ہی دیتی ہیں تو وہ مستحق ہے کہ ان نعمتوں سے محروم کر دی جائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔ البتہ اس کے علاوہ جو گناہ ہیں، ان کو جس کے لیے چاہے گا، معاف کر دے گا، پھر اہل کتاب کے تین شرک گنائے ہیں۔

۱۔ پاکی اور برتری کا دعویٰ،

۲۔ ایمان بالجبت والطاغوت،

۳۔ حمیت شرک،

یہاں ہم ان تینوں کی شرح کریں گے، لیکن طوالت سے بچنے کے لیے اختصار کو پیش نظر رکھیں گے۔

۳۔ پاکی و برتری کا دعویٰ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۔ (ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں!) سے یہود و نصاریٰ کے اس خیال کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ۔ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۔ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۔ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۔ (المائدہ ۵:۱۸)

''اور یہود اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، ان سے پوچھو کہ پھر وہ تمہیں تمہارے جرموں پر سزا کیوں دیتا رہا ہے؟ بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں سے بشر ہو۔ وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔''

سورۂ جمعہ میں ہے:

قُلْ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (الجمعۃ ۶۲:۶)

''ان سے کہو کہ اے وہ لوگو جو یہودی ہوئے! اگر تمہارا گمان ہے کہ دوسروں کے مقابل میں، تم اللہ کے محبوب ہو، تو موت کے طالب بنو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔''

اوپر مشرکین کے بیان میں خود پرستی کے عنوان سے، ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس مقام کو سمجھنے کے لیے اس پر ایک نظر ڈال لینا مفید ہوگا، مشرکین اور اہل کتاب کے قلوب میں مشابہت کا ذکر قرآن نے کئی جگہ کیا ہے۔ یہ بھی اسی مشابہت کی ایک قسم ہے جس طرح مشرکین خانہ کعبہ کی بدولت ایک عرصہ تک مرجع خلائق بنے رہنے اور امن و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ جو کچھ انہیں حاصل ہے ان کے استحقاق ذاتی کا ثمرہ، ان کے حسب و نسب کا لازمی نتیجہ اور ان کے علم و تدبر کا کرشمہ ہے، وہ اسی حال میں رہیں گے یہ عزت یہ سادت، یہ سربراہی ان کے لیے اب وجد کی چھوڑی ہوئی میراث ہے، جن کی قیمت ان کے باپ دادا ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اپنی نیکیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ادا کر چکے ہیں اور اب ان کو کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ٹھیک اسی طرح اہل کتاب بھی ایک عرصہ کی متوارث عظمت دینی و دنیاوی کی مسند پر متمکن رہنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ قوموں کی سربراہی اور قیادت ان کا فطری منصب ہے، جس پر وہ اس لیے سرفراز کیے گئے ہیں کہ وہ خدا کی برگزیدہ مخلوق ہیں، اس کے محبوب اور چہیتے ہیں اور اس کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں۔

تورات وغیرہ میں جو عزتیں اور بزرگیاں صفات و اخلاق کے ساتھ وابستہ کی گئی تھیں

وہ تمام کی تمام انہوں نے اپنی قوم اور اپنی نسل کے ساتھ خاص کر دیں، اس خبط میں پڑ جانے کے بعد ان کا سارا اعتماد اس بات پر رہ گیا کہ وہ ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کی اولاد ہیں اور ان اکابر کی اولاد میں ہونا ہی خدا کے یہاں تقرب اور اس کی پکڑ سے نجات کے لیے کافی ہے، عمل و اطاعت کی چنداں ضرورت نہیں ہے، یہیں سے ان کو یہ خیال بھی پیدا ہو گیا کہ جہنم کی آگ ہمیں چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ ہمیشگی کی جہنم ہمارے لیے نہیں ہے، یہیں یہ خبط بھی ان کو پیدا ہو گیا کہ دنیا کو دین و ایمان کی روشنی اب صرف ہمارے ہی واسطہ سے مل سکتی ہے، کوئی دوسری قوم اس کا وسیلہ نہیں بن سکتی، قوم ہماری قوم ہے نبی ہمارا نبی ہے اور ہدایت صرف ہماری ہدایت ہے جو ہمارے اندر ہے وہ راہ یاب ہے، جو ہم سے باہر ہے وہ گمراہ ہے۔

یہود کے اسی غرّہ کی بنا پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم اولاد ابراہیم میں سے ہونے پر گھمنڈ نہ کرو، خدا ابراہیم علیہ السلام کے لیے زمین کے ذرّوں سے اولاد پیدا کر سکتا ہے، قرآن نے ان کے یہ سارے خیالات سورۂ بقرہ، وغیرہ میں نقل کیے ہیں اور ان کو امانی (جھوٹی آرزوئیں)، ظنون (بے بنیاد خیالات)، زخرف القول (ملمع کی ہوئی باتیں)، وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، اور ان میں سے ایک ایک وہم کی تردید کی ہے اور ان خیالات ہی کی بنا پر ان کو ہدایت الٰہی کی پیروی سے محروم قرار دیا، ان کو رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کا مجرم ٹھہرایا، یہاں تک کہ ان کو اسلام، خدا کی بندگی اور اخلاص (یعنی توحید) سے بھی محروم قرار دیا اور ان کی دعوت ''كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا'' (البقرہ ۲:۱۳۵) (یہود یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے) کی جگہ امت وسط، یعنی مسلمانوں کا کلمہ یہ بتایا:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ

شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ
أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ
وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ

(البقرہ ۲:۱۳۶-۱۳۹)

''کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰ و عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں، اگر وہ اس طرح ایمان لاتیں جس طرح تم ایمان لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو پھر وہ درپے مخالفت ہیں، ان کے مقابل میں تمہارے لیے اللہ کافی ہوگا، وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، کہہ دو: یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اس کی بندگی کرتے ہیں، کہہ دو کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کر رہے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے۔ وہی تمہارا بھی رب ہے ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے، اور ہم خالص اسی کے لیے ہیں۔''

ان آیات میں نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (ہم اسی کے فرمانبردار ہیں) وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ (ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں) وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ (ہم خالص اسی کے لیے ہیں) کے الفاظ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں، ان تینوں میں اہل کتاب پر تعریض ہے کہ نہ تم مسلم ہو، نہ خدا کی بندگی کرنے والے ہو، نہ موحد ہو، جو خدا کا فرمانبردار، خدا کا بندہ و غلام اور صرف اللہ واحد ہی کا ماننے والا ہوگا، وہ اپنے تئیں خدا کے رنگ میں رنگے گا، یہودیت یا نصرانیت کے رنگ سے کیوں ملوث ہوگا؟ وہ اللہ کی ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ جس شکل اور جس زبان میں بھی آئے یا اور سب نبیوں پر ایمان لائے گا، خواہ وہ کسی قوم میں مبعوث ہوئے ہوں، وہ یہ نہیں کرے گا کہ کسی کو مانے اور کسی کا انکار کر دے، یہ ساری باتیں اخلاص اور توحید کے منافی ہیں، یہ تم خدا کی بندگی نہیں کر رہے ہو، بلکہ اپنی اپنی قوم کی اور اپنے اپنے نبی کی پرستش کر

رہے ہو۔

یہ آیت ان مسلمانوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے جو الگ الگ اماموں کی عصبیت میں گرفتار ہیں اور اپنے ہی گروہ کے امام یا علماء کے اندر حق و ہدایت کو محصور مانتے ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ اگر کسی ایک نبی یا انبیاء کی کسی ایک ہی جماعت پر جم جانا اور دوسروں کا انکار کر دینا جائز نہیں ہے اور یہ اخلاص و توحید کے منافی ہے تو کسی ایک امام یا علماء کی کسی ایک ہی جماعت کے اندر حق کو محدود کر دینا خدا پرستی، اتباع ہدی اللہ و سنت رسول اور توحید کی روح سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتا ہے!

۴۔ ایمان بالجبت والطاغوت

جبت سے مراد سحر، شعبدے، گنڈے، ٹونے ٹوٹکے اور رمل جفر، وغیرہ ہیں۔

بائیبل ہسٹری اور یہود کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے کلدانیوں کے تمام علوم سفلیہ سیکھ لیے تھے۔ یہ چیزیں تاریخ کے ہر عہد میں اہل مذاہب کے لیے فتنہ بنی رہی ہیں، مذہب کی سیدھی سادی، بلکہ کڑوی کسیلی، تعلیمات جب بے مزہ معلوم ہونے لگتی ہیں اور نفس چٹخاروں کی تلاش میں ہوتا ہے تو یہ چیزیں رواج پا جاتی ہیں، یہ چیزیں مذہب کی اصلی روح کی موت کی نشانی ہیں، جس دن یہ فتنے کسی قوم میں شروع ہوئے وہی دن مذہب کی پاک تعلیم کے زوال کا روز اوّل ہوتا ہے، جو لوگ ان چیزوں میں منہمک ہوتے ہیں کتاب الٰہی سے ان کا تعلق ٹوٹ جانا لازمی ہے ان دونوں کے سرچشمے دو ہیں۔ ایک کا مصدر و منبع شیطان ہے، اور دوسرے کا سرچشمہ رحمان ہے جو لوگ شیطان سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں ان کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ خدا سے کٹ جائیں اور نبیوں کی تعلیم اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیں، چنانچہ یہود کا یہی حال ہوا۔

سورۂ بقرہ میں ان کی اسی جبت پرستی کا ذکر ہے:

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۙ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ (البقرہ ۲:۱۰۱-۱۰۳)

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول ان پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر آیا جو انکے پاس موجود ہیں تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینکا گویا اس سے آشنا ہی نہیں اور ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھتے پڑھاتے تھے، حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا، بلکہ شیطانوں ہی نے کفر کیا یہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور اس چیز میں پڑ گئے جو بابل میں دونوں فرشتوں ــــ ہاروت و ماروت ــــ پر اتاری گئی تھی۔''

''طاغوت'' بروزن ملکوت و جبروت ''طغی'' کے مادہ سے ہے، جس کے معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، جو چیز حد مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لیے عربی میں کہیں گے: طغٰی۔ طغی الماء، پانی حد سے آگے بڑھ گیا۔ قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی اس کے لیے قرآن میں ''طاغیة'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدود عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لیے استعمال ہوا اور جو چیز حدود بندگی سے نکل جائے، اس کو طاغوت کہنے لگے، پھر وہ چیزیں بھی اس کے تحت آگئیں جو حدود بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہوں، اہل لغت اسی وجہ سے اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: **الطاغوت عبارة عن کل متعدد و کل معبود من دون اللّٰہ۔** (طاغوت سے مراد ہر وہ شے ہے جو حد سے نکل جائے اور ہر وہ معبود جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے۔)

قرآن نے اس لفظ کو مختلف مقامات میں استعمال کیا ہے اور ہر جگہ اس کے مقابل کا ذکر کر کے اس کے مختلف مفہوموں پر روشنی ڈال دی ہے مثلاً سورہ بقرہ میں ہے: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ (البقرہ ۲:۲۵۶) (تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا) یہاں

اللہ کے تقابل سے واضح ہے کہ طاغوت سے مراد ماسوا اللہ ہے۔ سورۂ نحل میں ہے: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (النحل ۱۶:۳۶) (کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو)۔ سورۂ نساء میں ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (النساء ۴:۷۶) (جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر کیا وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں) اس کے بعد فرمایا: فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ (النساء ۴:۷۶) (تو تم شیطان کے حامیوں سے لڑو) جس سے متعین ہو گیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے اور شیطان سے مراد شیاطین الانس والجن، دونوں ہیں اور قرآن میں غیر الٰہی دعوت و اطاعت کے لیے یہ ایک جامع تعبیر ہے، اسی طرح ایک دوسری جگہ اس لفظ کو کتاب الٰہی اور طریقہ رسول کے ضد کے لیے استعمال کیا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا

(النساء ۴:۶۰-۶۱)

''ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے، لیکن چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے، شیطان چاہتا ہے کہ انہیں نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ تم سے کترا جاتے ہیں۔''

ان آیات میں ''يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ'' کے بالمقابل ''تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ'' کہہ کر واضح کر دیا کہ طاغوت کتاب الٰہی اور سنت رسول کی ضد کے لیے ایک جامع تعبیر ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی بندگی و اطاعت سے نکل جائے یا نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہو، وہ سب طاغوت کے حکم میں داخل ہے، پس شیطان، ساحر، کاہن، اصنام و اوثان، فرعون و نمرود، اللہ کی ہدایت سے ہٹانے والے لیڈر، غیر الٰہی حکومتیں، غیر الٰہی عدالتیں، غیر الٰہی درسگاہیں، غیر الٰہی خانقاہیں سب اس کے تحت آتی ہیں اور اہل کتاب شرک کی اس قسم مبتلا تھے۔

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (المائدہ ۵:۶۰)

''یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور سور بنائے اور جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی، یہ ٹھکانے کے لحاظ سے بدتر اور اصل شاہراہ سے بعید تر ہیں۔''

۵۔ حمایت شرک

اہل کتاب کا تیسرا شرک حمایت شرک ہے، شرک کی حمایت خواہ کسی نوعیت سے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو اپنی کتاب عنایت فرمائی تھی۔ ان سے اپنی شریعت کی پابندی کا عہد لیا تھا۔ ان کے اوپر آئندہ مبعوث ہونے والے نبی کی حمایت و تائید اور لوگوں سے اس کا تعارف کرانے کی ذمہ داری ڈالی تھی، یہود سے کہا گیا تھا کہ: ''میں ان کی لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی وہ ان سے کہے گا۔'' (بائبل: استثناء۔ باب۔ ۱۸:۱۸-۱۹) حضرت مسیح علیہ السلام اپنے حواریوں سے صاف صاف فرما گئے تھے کہ: ''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔'' (انجیل یوحنا۔ باب۔ ۱۶:۱۲-۱۳) یہود کو اس نبی کی بعثت کا انتظار بھی تھا اور وہ اپنے یہاں کی پیشین گوئیوں کے مطابق یقین بھی رکھتے تھے، کہ یہ نبی ان کی سعادت کا فتح باب ہوگا اور ان کو کفار پر فتح دلائے گا: وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (البقرہ ۲:۸۹) (اور وہ پہلے سے کافروں

کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے) اور نصاریٰ تو گویا یکسر چشم انتظار ہی تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے انجیل میں جو تمثیلیں بیان فرمائی ہیں، اگر ان کی تشریح کر دی جائے تو معلوم ہوگا کہ امثال انجیل کا بڑا حصہ آخری بعثت کی سرگزشت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

ان حالات کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اصلی فریضہ یہ تھا کہ جب آخری بعثت ظہور میں آئی تو اپنے سابق علم کی روشنی میں اس کو جانچتے پرکھتے، اگر اس کو اپنی پیشین گوئیوں کے مطابق پاتے اس پر ایمان لاتے، لوگوں میں اس کو پہنچواتے، اس کی حمایت وتائید کرتے اور پھر اس کے لائے ہوئے دین کی اقامت کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیتے، لیکن ان لوگوں کا حال وہی ہوا جو حضرت مسیح علیہ السلام نے کنواریوں والی تمثیل میں بیان فرمایا ہے کہ رات بھر تو وہ اپنی مشعلیں جلائے ہوئے دولہا کا انتظار کرتی رہیں، لیکن جب دولہا کے آنے کا وقت ہوا تو ان کی مشعلیں بجھ گئیں، ان کی کپیوں کا تیل ختم ہو گیا اور وہ خود سو گئیں، صدیوں تک تو یہ لوگ منتظر رہے، لیکن جب اس کا ظہور ہوا اور ان لوگوں نے اس کو پہچان بھی لیا تو ایمان کے بجائے اس کے انکار میں سبقت کی اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ حسد وعناد کے جوش میں کھلم کھلا ان مشرکین کی حمایت ونصرت میں کھڑے ہو گئے جو اس دعوت کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے، علی الاعلان اس کی تعلیمات کا مذاق اڑایا، اس کے کام کو روکنے کے لیے، جنگیں برپا کیں، اور اس عداوت کے جوش میں اس حد تک اتر آئے کہ مشرکین کے دین کو اس کی دعوت پر ترجیح دیتے اور کفار کو اس کے پیروؤں سے زیادہ برحق اور ہدایت یافتہ بتانے لگے: وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (النساء ۴:۵۱) (اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں) اس شرک دوستی کی توحید کے ساتھ کسی لگاؤ کی گنجائش کہاں رہتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا (النساء ۴:۵۲) (یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم ان کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے)۔

باب ۴

منافقین کا شرک

جہاں تک ظاہری اعتقاد و عمل کا تعلق ہے منافقین پورے مسلمان تھے، ایمان کے جتنے اجزاء ہیں، ان سب کا ان کو اقرار تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے تمام انبیاء کی رسالت بھی ان کو تسلیم تھی، کلمہ شہادت بھی وہ پڑھتے تھے، مسجدوں میں اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ پر نمازیں بھی ادا کر لیتے تھے، زکوٰۃ بھی دے دیتے تھے۔ خانہ کعبہ کا حج بھی کر آتے تھے، غزوات میں بھی شریک ہو جاتے تھے، بلکہ قرآن سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک زبانی اظہار کا تعلق ہے، جہاد کا ولولہ بمقابلہ سچے مسلمانوں کے زیادہ ظاہر کرتے تھے، اور ایمان بالرسالت کی ظاہر داریوں کا تو یہ عالم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور قسمیں کھا کھا کے یقین دلاتے کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں، لیکن ان ساری باتوں میں سے ان کی ایک بات بھی قرآن نے تسلیم نہیں کی، بلکہ ان کو ایمان سے محروم، رسالت کا منکر، شیطان کا ساتھی، جہنم کے سب سے نچلے طبقہ کا مستحق اور صاف صاف لفظوں میں شرک کا مجرم قرار دیا۔

تمام آیتوں کا استقصاء یہاں مشکل ہوگا، لیکن ان کے شرک سے متعلق چند آیتیں ہم نقل کر کے ان پر بالا جمال گفتگو کریں گے، قرآن مجید نے منافقین کو تحاکم الی الطاغوت کا مجرم قرار دیا ہے اور اس تحاکم الی الطاغوت کو شرک بتایا ہے۔

تحاکم الی الطاغوت

سورۂ نساء میں فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا

(النساء ۴:۶۰، ۶۱)

''ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے، اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے، لیکن چاہتے ہیں کہ ان کے اپنے معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے، شیطان چاہتا ہے کہ انہیں نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ تم سے کترا جاتے ہیں۔''

اس سے اوپر والی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ، رسول اور اپنی جماعت کے اولوالامر کی اطاعت کرو اور اگر کسی امر میں اختلاف واقع ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو، اس کے بعد منافقین کا حال بیان فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے مدعی ہونے کے باوجود چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں، اللہ اور اس کے رسول کی عدالت میں نہ لائیں۔

اوپر ہم لفظ طاغوت کے مفہوم پر بحث کر چکے ہیں، اس آیت میں طاغوت کے بالمقابل تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ (اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ) کے الفاظ آئے ہیں، جس سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ طاغوت سے مراد وہ حکام ہیں جن کے فیصلے کتاب الٰہی اور رسول کے فیصلے کے خلاف ہوتے ہیں اور آیات کے سیاق وسباق

سے واضح ہے کہ یہاں اس سے مراد اہل کتاب کے حکام اور ان کی عدالتیں ہیں، یہ اس عہد کا حال بیان ہوا ہے جب مدینہ میں بالفعل دارالاسلام قائم ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے تمام معاملات از قسم حدود و تعزیرات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہو کر طے پانے اور نافذ ہونے لگے تھے، لیکن ساتھ ہی ایک متوازی حکومت (PARALLEL STATE) یہود کی، پہلے سے قائم اور ہنوز موجود تھی۔ اس نظام کی موجودگی کی وجہ سے ایک بڑی پیچیدگی یہ پیدا ہو رہی تھی کہ منافقین اپنے بہت سے نزاعی امور میں ان یہودی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تھے، ان کے ایسا کرنے کی دو بڑی وجہیں تھیں، ایک یہ کہ یہود کے حکام کو رشوتیں دے کر ان سے اپنے موافق فیصلے کرا لینا نہایت آسان تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں اس چیز کا کوئی امکان نہیں تھا دوسری یہ کہ منافقین کو یہ ڈر لگا ہوا تھا، کہ ابھی مدینہ کی اسلامی حکومت بالکل ابتدائی حالت میں ہے، ہر چند قریش کی طاقت اس نے توڑ دی ہے، لیکن یہود کی منظم جماعت سے اس کی ٹکر ابھی براہ راست نہیں ہوئی ہے، ممکن ہے کل کو یہ تصادم واقع ہو اور جیت یہود ہی کی رہے تو تھوڑا بہت لگاؤ، جو ان کے ساتھ قائم رہے گا، وہ کل کام آئے گا، ورنہ یہ یہودی مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ ہمارا ابھی خاتمہ کر دیں گے، اس ظن فاسد کی وجہ سے یہ لوگ اپنے معاملات زیادہ تر تو انہی کی عدالتوں میں لے جاتے، البتہ اگر کوئی معاملہ ایسا ہوتا جس میں وہ سمجھتے کہ اسلامی عدالت سے فیصلہ کرانا مفید رہے گا تو نہایت فرمانبردارانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

دوسری طرف یہود یہ شرارت کرتے تھے، کہ تعزیرات و حدود کے اہم معاملات میں جس میں کسی ذاتی یا سیاسی مصلحت کی وجہ سے اپنی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرنا چاہتے، فریقین معاملہ کو یہ مشورہ دیتے کہ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لے جائیں، اور ساتھ ہی ان کو یہ ہدایت بھی کر دیتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ فیصلہ کریں تو مان لینا اور اگر کچھ اور فیصلہ کریں تو ہمارے پاس لوٹ آنا۔ اس طرح کے معاملات عموماً دولت مند یہودیوں کے

ہوتے تھے، جن سے بھاری بھاری رشوتیں لے کر علماء یہود شریعت الٰہی کی تنفیذ سے بچنے کی یہ شکل اختیار کرتے تھے، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں فیصلہ حسب منشا ہوتا تو مقصد حاصل اور ذمہ داری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی، اور اگر فیصلہ خواہش کے خلاف ہوتا تو اس کو چھوڑ کر خود اپنی عدالت میں اپنے منشا کے مطابق فیصلہ کرتے۔

مذکورہ بالا آیات اور اس کی مشابہ آیات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے اس شان نزول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

ان منافقین کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ تحاکم الی الطاغوت یعنی غیر اسلامی عدالتوں میں اپنا معاملہ لے جانا اور پھر قرآن اور اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرنا دو متناقض چیزیں ہیں۔ ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے، اور الا اللہ کے اثبات سے پہلے لا الٰہ کی نفی ناگزیر ہے ـــــ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ (البقرہ ۲:۲۵۶) (تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا)۔ دوسری جگہ ہے اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) (اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو)۔ ایمان باللہ اور ایمان بالطاغوت، دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے، یہود کی عدالتوں میں اگر اپنے معاملات لے جاتے ہو تو تمہارا ایمان بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا دعویٰ ایک زعم باطل ہے، ایمان بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ تمام معاملات میں اللہ ہی کی اطاعت کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انبیاء کے راستہ کی پیروی کی جائے اگر ایسا نہیں ہے تو نہ یہ ایمان باللہ ہوا نہ ایمان بما انزل اللہ ہوا نہ ایمان بالرسول ہوا۔ رسول صرف اس لیے نہیں ہوتا کہ اعتقاد کی حد تک یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ رسول ہے بلکہ وہ اطاعت کے لیے ہوتا ہے اور خدا کی اطاعت کی راہ اس کی اطاعت کے اندر ہی سے ہو کر نکلی ہے۔ چنانچہ بعد کی آیات میں فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا

بَلِيْغًا ﴿٦٣﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

(النساء ۴:۶۲-۶۵)

''اس وقت کیا ہوگا، جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی، پھر یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ خدا کی قسم، ہم نے تو صرف بہتری اور سازگاری چاہی ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے، تو ان سے اعراض کرو، ان کو سمجھاؤ اور ان سے خود ان کے باب میں دل میں دھنسنے والی بات کہو، اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اس لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے، اور اگر وہ جب کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا، تمہاری خدمت میں حاضر ہوتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے، پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کردو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کردیں۔''

مذکورہ بالا آیات میں وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے) خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے یہ منافقین کے اس زعم باطل کی تردید ہے کہ وہ تحاکم الی الطاغوت کے باوجود اپنے تئیں مومن باللہ و مومن بالرّسول سمجھتے ہیں، رسول صرف اس لیے نہیں آیا کرتا کہ زبان سے اس کی رسالت کا اقرار کرلیا جائے، یا دل میں یہ عقیدہ رکھ لیا جائے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، بلکہ اس لیے آتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، جملہ امور میں اس کو حکم مانا جائے، اس کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے، اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کردیا جائے اور جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستہ سے الگ ہیں، ان سے بغاوت کی جائے، چنانچہ اس آیت میں قسم

کھا کر فرمایا کہ جب تک یہ لوگ اپنے تمام معاملات میں رسول کی حکومت تسلیم نہ کر لیں، اس کے فیصلوں کو دل کی پوری رضامندی کے ساتھ نہ مانیں اور اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں اس کے امر و نہی کے تابع نہ ہو جائیں، اس وقت تک یہ مومن باللہ نہیں ہیں، مومن بالطاغوت ہیں۔

اوپر ہم نے جو باتیں بیان کی ہے ممکن ہے اس کے بارہ میں کسی کو شبہ ہو کہ آیات کا شان نزول ـــــ پس منظر ـــــ متعین کرنے میں ہم نے محض اپنے تخیل سے کام لیا ہے۔ ان کے اطمینان کے لیے ہم ان کو سورۂ مائدہ کی آیات (۴۱-۵۴) کا حوالہ دیتے ہیں، جو لوگ ان آیتوں پر تدبر کریں گے، وہ ان ساری باتوں کا ماخذ خود قرآن میں پا جائیں گے، جو ہم نے بیان کی ہیں، ان آیات کا مطلب اختصار کے ساتھ ہم اپنے لفظوں میں یہاں بیان بھی کیے دیتے ہیں تا کہ مراجعت میں آسانی ہو:

"پہلے رسول کو تسلی دی ہے کہ منافقین اور یہود آپ سے معاملات کا فیصلہ کرانے کے بعد جو اس سے اعراض کرتے ہیں تو اس سے غمگین نہیں ہونا چاہیے، یہ یہودی اپنے معاملات کبھی کبھی آپ کے پاس جو لاتے ہیں تو یہ جھگڑا چکانے اور مقدمے کا فیصلہ کرانے کے لیے نہیں لاتے، بلکہ یہ جھوٹ کے خریدار اور سرداران یہود کے ایجنٹ ہیں، وہ سامنے نہیں آتے، بلکہ پیچھے بیٹھے ہوئے ان کٹھ پتلیوں کو نچاتے ہیں، اور اللہ کے دین میں کتر بیونت کرتے ہیں اور آپ کے پاس ان کو یہ سکھا کر بھیجتے ہیں، کہ اگر تمہارے معاملہ کا یہ فیصلہ ہو تو مان لینا، اور اگر اس کے خلاف فیصلہ ہو تو واپس چلے آنا، ایسے لوگوں کی حالت پر غم کرنا عبث ہے، اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں ہے کہ ان کے دلوں کو پاک کرے، ورنہ تورات کی ہدایت کے مطابق یہ لوگ آپ پر ایمان لاتے، کفر کے بجائے ایمان و اطاعت الٰہی کی طرف سبقت کرتے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے، یہ جھوٹ کے ماننے والے اور رشوت

کھانے والے ہیں، اگر آپ کے پاس یہ اپنا معاملہ لائیں تو آپ کو اختیار ہے کہ ان کے معاملہ میں پڑیے یا نہ پڑیے، ہاں اگر پڑیے تو لازم ہے کہ اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ کیجیے۔

اس کے بعد چند آیتوں میں یہود کو ملامت کی ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں کہ آپ کو حکم بناتے ہیں، پھر آپ کے فیصلہ سے مکر جاتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس تورات موجود ہے، جس میں اللہ کا قانون موجود ہے، اور انہیں معلوم ہے کہ آپ کا فیصلہ قانون الٰہی کے خلاف نہیں ہے، پھر گزشتہ انبیاء اور علماء صالحین کا طریقہ بتایا کہ وہ اس کتاب کے مطابق تمام معاملات کے فیصلے کرتے تھے، پھر فرمایا کہ ان کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت اور خیانت کو راہ نہ دیں گے، اور شریعت کو کسب دنیا کا ذریعہ نہ بنائیں گے، بلکہ ہر حال میں کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں گے، اور اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو کافر ہوں گے، اس کے بعد تورات کے قانون قصاص کا حوالہ دیا ہے۔ کیونکہ یہود کی اصل مداہنت حدود اور قصاص وغیرہ کے معاملات ہی میں تھی اس کے بعد انجیل کا ذکر فرمایا کہ ان کو بھی ہدایت کی گئی تھی کہ شریعت الٰہی کے مطابق فیصلے کریں گے، اور اگر اس کے خلاف کریں گے تو فاسق ٹھہریں گے۔

پھر قرآن کا ذکر فرمایا کہ یہ کتاب تورات و انجیل کی پیشین گوئیوں کے مطابق اور ان کی تحریفات اور ملاوٹوں کی اصلاح کرنے والی ہے، پس آپ کا فرض ہے کہ اگر ان کے کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا ہو تو اس کے مطابق کیجیے اور ان کی بدعات کی جو انہوں نے اپنی کتابوں میں ملا رکھی ہیں، ہرگز پیروی نہ کیجیے۔ ان کے ایمان و ہدایت کا سوال آپ سے نہ ہوگا، ان کا اپنا جو طریقہ ہے اسی پر جامد

ہو گئے ہیں اور ان کی عصبیت میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں کہ آپ کی پیروی نہیں کریں گے، اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت کے راستہ پر کر دیتا، لیکن جبر کرنا اس کی سنت خلاف ہے۔ اس نے اختیار بخشا ہے اور جس کو جو کچھ دیا ہے اس میں اس کی آزمائش کی ہے کہ دیکھے کون نیکی اور اطاعت کی راہوں میں بڑھتا ہے اور کون عصبیت جاہلیت کی حماقت میں مبتلا ہو کر اپنے طریقے اور دھڑے ہی کو معبود بنا لیتا ہے۔"

اس کے بعد مسلمانوں کی طرف توجہ فرمائی اور خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جو یہود سے ساز باز رکھتے تھے اور اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، ان کو یہود و نصاریٰ سے قطع تعلق کا حکم دیا اور فرمایا کہ جو لوگ ان کو اپنا مددگار بنائیں گے ان کا شمار انہی میں ہوگا، پھر صاف صاف لفظوں میں منافقین کا ذکر فرمایا کہ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر یہود اور مسلمانوں میں ٹکر ہوئی اور یہود فتح مند رہے تو یہ پس جائیں گے۔ اس لیے یہ اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں تاکہ ان کی پارٹی میں سمجھے جائیں، پھر فرمایا کہ اے مسلمانو! جو تم میں سے اپنے دین سے مرتد ہو جائیں گے تو اللہ کو ان کی کچھ پروا نہیں، اللہ اس کے بعد ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے وہ مومنوں کے لیے نرم خو اور بردبار ہوں گے، اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔

یہ ساری تفصیل ہم نے محض یہود کی اس وقت کی سیاست اور ان کے ساتھ منافقین کے تعلقات کی نوعیت سمجھانے کے لیے بیان کی ہے تاکہ تحاکم الی الطاغوت کا صحیح تصور ذہنوں کے سامنے آسکے اور یہ واضح ہو سکے کہ منافقین اس سے کیا فوائد پیش نظر رکھتے تھے اور پھر یہ معلوم ہو سکے کہ کس طرح یہ ایک ہی چیز دین کے تمام اقرارات و اعترافات کو ڈھا دینے والی اور تمام عبادتوں اور طاعتوں کو سوخت کر دینے والی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن نے

نہایت صاف لفظوں میں اس کو دین سے ارتداد قرار دیا ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ خدا کو ایسے لچ لچے ایسے مریض القلوب اور ایسے بزدل اور نفع پرست لوگوں کی ضرورت نہیں ہے، جو یہود کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح ناچیں، اس کو صرف ایسے لوگوں سے محبت ہے جو اپنی سیرت میں چٹان کی طرح ٹھوس اور اپنے عزم و ارادہ میں لوہے کی طرح مضبوط ہوں، جو اسلام میں مصلحت پرستی اور نفع پرستی کے بت توڑ کر داخل ہوئے ہوں اور بغیر کسی تقسیم کے اپنی پوری زندگی اللہ کے حوالہ کریں: اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (البقرہ ۲:۲۰۸) (اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ)۔ جو لوگ صرف فوائد کی حد تک خدا کے پرستار رہنا چاہتے ہیں وہ اپنے لیے جو دین چاہیں پسند کر لیں اللہ اور اسکے دین کو ان کی ضرورت نہیں ہے:

مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَہٗ خَیْرُ ا طْمَاَنَّ بِہٖ وَاِنْ اَصَابَتْہُ فِتْنَۃُ انْقَلَبَ عَلٰی وَجْہِہٖ (الحج ۲۲:۱۱) (اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچا تب تو ان کا دل خدا پر جمتا ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آ گئی تو اوندھے ہو جاتے ہیں)۔

توضیح مطلب اور شرح صدر کے لیے سورۂ نور کی یہ آیتیں بھی سامنے رکھیے:

وَ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنْ یَّکُنْ لَّھُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْۤا اِلَیْہِ مُذْعِنِیْنَ ﴿۴۹﴾ؕ اَفِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ وَ رَسُوْلُہٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ؑ اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَخْشَ اللّٰہَ وَ یَتَّقْہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ لَئِنْ اَمَرْتَھُمْ

لَيَخْرُجُنَّ ۖ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۖ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۵۳
قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ
عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۖ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۖ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ۝۵۴ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي
الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي
ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۖ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ
شَيْـًٔا ۖ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور ۲۴:۴۷-۵۵)

''اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی پھر ان میں سے ایک گروہ پھر جاتا ہے اور یہ لوگ درحقیقت مومن نہیں ہیں اور جب یہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ پہلوتہی کرتا ہے اور اگر حق ان کو ملنے والا ہو تو اس کی طرف نہایت فرمانبردارانہ آتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے، یا یہ ابھی شک میں پڑے ہوئے ہیں، یا ان کو اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے ساتھ ناانصافی کریں گے، بلکہ یہ لوگ خود ظالم ہیں، اہل ایمان کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی کسی باہمی نزاع کے فیصلہ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا اور درحقیقت یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے، اور جو اس سے ڈریں گے اور اس کے حدود کی پاسداری کریں گے، وہی لوگ ہیں جو فائز المرام ہوں گے اور انہوں نے پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر تم ان کو جہاد کا حکم دو گے تو وہ ضرور نکلیں گے، کہہ دو کہ قسمیں نہ کھاؤ، بس دستور کے مطابق اطاعت اصل چیز ہے! جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے ان سے کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پس اگر تم اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ رسول پر صرف وہ ذمہ داری ہے جو اس پر ڈالی گئی ہے اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو راہ یاب ہو گے اور رسول پر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا، جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار

بخشا جو ان سے پہلے گزرے، اور ان کے اس دین کو متمکن کرے گا، جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا، وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔"

جن لوگوں نے ایمان کا مطلب صرف چند چیزوں پر اعتقادی ایمان سمجھ رکھا ہے ان کو ان آیات پر غور کرنا چاہیے، منافقین ان سب چیزوں پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، لیکن قرآن نے ان کے اس اعتراف و اعتقاد کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ صاف صاف فرمایا کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ یہ ایمان و اسلام کیسا کہ اپنے جملہ معاملات میں اللہ اور رسول کی حکومت نہیں تسلیم کرتے۔ جب اپنا فائدہ ہوتا ہے تب تو رسول کے پاس دوڑے ہوئے آتے ہیں، لیکن جب اندیشہ ہوتا ہے کہ رسول کے فیصلہ میں ان کا دنیوی خسارہ ہے تو یہود کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جاتے ہیں کہ ان کی رشوت خوری اور مداہنت سے فائدہ اٹھائیں، ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے یہ اسلام کے غلبہ کی طرف سے مشتبہ ہیں، انہیں اللہ اور رسول کے عدل پر بھروسہ نہیں ہے پھر واضح الفاظ میں فرمایا کہ مومن صرف وہ لوگ ہیں جو اپنے تمام معاملات اللہ و رسول کی عدالت میں پیش کریں اور یہاں سے جو فیصلہ ہو اس کو بے چون و چرا تسلیم کریں، آخری آیت کے الفاظ خصوصیت کے ساتھ غور کے قابل ہیں۔ سچے مسلمانوں کو بشارت دی ہے کہ منافقین اسلام کے غلبہ کی طرف سے شبہ میں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے علی الرغم اہل ایمان کو غلبہ دے گا، دین حق کا بول بالا کرے گا اور یہود اور مشرکین کی وجہ سے جو خوف و اندیشہ کی حالت ابھی قائم ہے اس کو جلد امن و اطمینان سے بدل دے گا اور ہمارے یہ خالص بندے صرف ہماری ہی بندگی کریں گے، کسی کو ہمارا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

یہ منافقین پر تعریض ہے کہ یہ لوگ غیر اللہ کی بندگی کرتے اور اللہ کا ساجھی ٹھہراتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ تعریض محض اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے معاملات یہود کی عدالتوں میں لے

جاتے ہیں، جولوگ عبادت کے مفہوم میں اطاعت کو داخل نہیں سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ اگر نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور روزے رکھے جاتے ہیں تو اطاعت خواہ کسی طاغوت کی ہو رہی ہو اس سے خدا کی عبادت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا انہیں اس آیت پر غور کرنا چاہیے۔ اگر غیر اللہ کی اطاعت سے اللہ کی عبادت میں کوئی فرق نہیں آتا تو آخر ان منافقین کا کیا جرم تھا کہ ان کو مشرک اور غیر اللہ کی بندگی کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے اور قرآن سے غفلت کی وجہ سے لوگ اس بارہ میں ایسی غلط فہمیوں میں پڑ گئے ہیں جو سرے سے دین کی بنیاد ہی ڈھائے دے رہی ہیں، اس لیے مزید توضیح کی خاطر چند آیتیں ہم اور پیش کرتے ہیں، سورۂ نساء میں فرمایا ہے:

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (النساء ۴:۱۱۵-۱۱۶)

''اور جو کوئی راہ ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈالیں گے جس پر وہ پڑا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا، کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس کے نیچے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا، اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کی مخالفت کرنا اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کر لینا شرک ہے اور اس کی سزا جہنم ہے اور جہنم برا ٹھکانا ہے، ایک امر پر اس پہلو سے تو گفتگو ہو سکتی ہے کہ یہ اللہ و رسول سے ثابت ہے یا نہیں، لیکن اگر اس کا اللہ و رسول کی بات ہونا متعین ہے تو اس پر سرگوشی کرنا، اس کو خلاف حکمت قرار دینا، اس کو روح زمانہ کے خلاف کہنا اور اس کو چھوڑ کر اپنے جی سے یا

دوسروں کی تقلید میں کوئی اور راہ اختیار کر لینا شرک ہے اور اللہ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ، والی آیت ایک ہی سورہ میں دو جگہ وارد ہے، ایک جگہ اہل کتاب کے شرک کے بیان میں ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، اور یہ دوسری جگہ منافقین کے شرک کے بیان کے سلسلہ میں ہے، اور ایک صاحب نظر اگر ان دونوں مقامات پر غور کرے تو اسے نہایت آسانی سے قدر مشترک مل جائے گا، اہل کتاب کے بیان کے سلسلہ میں جہاں یہ آیت وارد ہے وہاں ان کے تین شرک بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی ہدایت پر اپنی قوم کی ہدایت کو ترجیح دیتے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ اللہ کی کتاب پر جبت و طاغوت کی پیروی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور تیسرا یہ کہ اہل ایمان کے طریقہ پر اہل مکہ کے طریقہ کو ترجیح دیتے ہیں اور یہاں اس آیت سے اوپر والی آیت میں یہ تمہید ہے: لَا خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَۃٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَیْنَ النَّاسِ ۔ (النساء ۴: ۱۱۴) (ان کی سرگوشیوں کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں کوئی خیر نہیں، خیر والی سرگوشی تو صرف اس کی ہے جو صدقہ کی صلاح دے یا کسی نیکی کی راہ سجھائے یا اصلاح ذات البین کی دعوت دے)۔ یعنی یہ منافقین، (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات، آپ کے احکام اور آپ کی تعلیمات کے خلاف جو سرگوشیاں کرتے ہیں ان میں کوئی بھلائی نہیں ہے خیر صرف اس سرگوشی میں ہے جو ترغیب صدقہ، امر بالمعروف اور لوگوں کی اصلاح کی راہ میں ہو، باقی جو لوگ خدا اور اس کے رسول کے حکم پر اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ اپنی خدائی کے مدعی ہیں اور اگر کسی دوسرے کی رائے اور مذہب کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کو الٰہ قرار دیتے ہیں اور ان دونوں صورتوں میں وہ مشرک ہیں، موحد نہیں ہو سکتے۔

باب ۵

پچھلے مباحث کا خلاصہ

اس تمام دراز نفسی اور طول بیان سے مقصود محض یہ دکھانا تھا کہ لا الٰہ کی نفی اور الّا اللہ کا اثبات زبان سے ادا کرنے کے لیے تو نہایت سہل اور مختصر ہے لیکن ان کے مقتضیات ولوازم کا مظاہرہ جب عملی زندگی میں ہوتا ہے تو انسان کی زندگی کا کوئی گوشہ ان کے دائرہ سے باہر نہیں رہ جاتا۔

یہ حقیقت پچھلے تین ابواب میں ایک موزوں تدریج کے ساتھ واضح ہوگئی ہے، اہل مکہ خدا کی ہستی اور اس کی تمام بنیادی صفات کے معترف تھے لیکن قرآن نے ان کے اس اعتراف کو کوئی وقعت نہیں دی، اہل کتاب نے ان سے بہت آگے بڑھ کر نہ صرف توحید کا بلکہ اس کی کتابوں کا، اس کے ملائکہ کا اور اس کے رسولوں کا بھی اقرار کیا، لیکن قرآن کی میزان میں ان کا اقرار بھی بالکل بے وزن ٹھہرا۔ سب سے آخر میں منافقین آئے اور انہوں نے خیال کیا کہ توحید کے مقتضیات ولوازم میں سے کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جو انہوں نے پوری نہ کر دی ہو اور شرک کی آلائشوں کا کوئی ایسا دھبہ ایسا نہیں رہ گیا ہے، جس کو انہوں نے دھونہ ڈالا ہو لیکن قرآن نے ان کے اندر سے بھی شرک کا کھوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا، اور ہر گروہ کو مطلع کر دیا کہ تم میں سے کوئی بھی خدا کا مخلص اور موحد نہیں ہے، ہر ایک نے اپنی بندگی میں دوسروں کو ساجھی بنا رکھا ہے اور اللہ کی نظر میں اُس بندگی کی کوئی قیمت نہیں، جس میں شرک کی ملاوٹ ہو۔

اب ان تینوں گروہوں کی فرد قرارداد جرم ملاحظہ ہو۔

بنی اسماعیل سے کہا گیا ہے:

تم فرشتوں کو مرتبہ بندگی سے مافوق سمجھتے ہو، ان کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہو، ان کی پوجا کرتے ہو، اس پوجا کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہو، مال واولاد اور دنیا کی خوش حالی و فارغ البالی کو ان کی برکت کا ثمرہ قرار دیتے ہو۔ خدا کے ہاں ان کی شفاعت، بہر حال، موجب نجات خیال کرتے ہو، ان سے خدا کی طرح محبت کرتے ہو، ان کو عالم الغیب مانتے ہو۔

اسی طرح جنات کو خدا کا کفو سمجھتے ہو۔ ان کو خدائی مفہوم میں نافع وضار خیال کرتے ہو۔ ان کی دہائی دیتے ہو۔ ان کی رضا طلبی کے لیے اپنی اولاد کو قتل کرتے ہو ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک مانتے ہو، ان کو علم غیب کا وسیلہ جانتے ہو۔ ان کی بندگی کرتے ہو۔ ان سے الہام حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کرتے ہو۔

کواکب کو تدبیر عالم میں موثر بالذات مانتے ہو۔ بارش کو نکھتروں کا فیض سمجھتے ہو۔ اپنی تمام کاروباری چہل پہل کو شعریٰ کی برکت سمجھتے ہو۔

تم نے اپنے ان معبودوں کی ایک بزم بنائی ہے اس میں خدا کی حیثیت بس ایک مہادیو کی ہے، جس کا تعلق محض اس کے دارالسلطنت، آسمان سے ہے۔

زمین اس کی مملکت کا ایک دور دراز علاقہ ہے، جس کا انتظام وہ اپنے عمال کو سپرد کر کے خود اس سے کنارہ کش ہے، تم ان معبودوں کی عبادت کرتے ہو، تم نے ان کے لیے معبد اور استھان بنائے ہیں، تم ان کے حج وزیارت کے لیے سفر کرتے ہو۔ ان کے لیے قربانیاں کرتے ہو، نذریں اور چڑھاوے پیش کرتے ہو، ان کے نام پر جانور چھوڑتے ہو، ان کے تعلق سے بہت سی چیزیں حرام وحلال کرتے ہو، ان کے حضور میں حاضر ہو کر، فال کے تیروں سے، ان کی مرضی معلوم کرتے ہو، ان کی قسمیں کھاتے ہو۔

تم نے اپنے بزرگوں کی قبروں اور ان کے آثار کو معبد بنا لیا ہے تم ان کو وسیلہ شفاعت اور ان کی عبادت کو ذریعہ تقرب الٰہی سمجھتے ہو۔ اس کی رسموں کو دین وشرع قرار دیتے ہو۔

پھر تم خود بھی الٰہ بن بیٹھے ہو، تم اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنے نفس کی خواہش یا دوسروں

کے قانون کی پیروی کرتے ہو، تم نے باپ دادا کے طریقوں اور رسوم و رواج کو شریعت بنا رکھا ہے، اور اس طرح سوسائٹی اور خاندان اور قبیلہ کو الٰہ بنائے بیٹھے ہو، اپنے جی سے قانون و شریعت بناتے ہو۔ تمہارے باپ، ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے ذریعے سے، اللہ تعالیٰ نے جو دین تمہیں دیا تھا اس میں تم نے اپنی بدعتیں ملا دی ہیں۔ تم خود اپنے شارع بن گئے ہو۔ تم اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ اور اپنے علم و ہنر کا نتیجہ سمجھتے ہو۔ تم کو اپنی برتری کا گھمنڈ ہے، تم کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کا غرہ ہے تم سمجھتے ہو کہ تمہارا ہر کام بلا استناد شریعت اللہ کا کام ہے، یہ ساری باتیں شرک ہیں، خدا پرستی کے دعوے کے ساتھ ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

اہل کتاب سے قرآن نے کہا:

تمہارا دعوائے توحید و خدا پرستی بھی باطل ہے تم اپنے علماء اور راہبوں کو قانون سازی اور تحریم و تحلیل کا اختیار دیتے ہو، یہ جو کچھ فرما دیں تمہارے نزدیک وہ قادر مطلق کے احکام ہیں، یہ زمین پر جو باندھیں وہ آسمان پر باندھا جاتا ہے اور زمین پر جو کھولیں وہ آسمان پر کھولا جاتا ہے، تم نے کتاب اور طریقہ نبی سے اجتہاد کی جگہ کاہنوں کے اقوال کو دے رکھی ہے، یہود عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، نصاریٰ مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، ان کو خدا کا اوتار قرار دیتے ہیں، الوہیت کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور خدا کو اس تین کا تیسرا قرار دیتے ہیں۔

پھر تم اپنی برتری کے مدعی ہو، تمہیں ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کا گھمنڈ ہے، تم اسی نسبت کو خدا کے تقرب اور اس کے محبوب ہونے کے لیے کافی سمجھتے ہو اور خدا کی اطاعت سے نکل کر طاغوت بن بیٹھے ہو، تم نے کتاب الٰہی کے حامل ہونے کے باوجود جبابرہ کی بندگی اختیار کی اور طاغوتی نظام یا تو خود قائم کیے یا ظالموں کے قائم کردہ طاغوتی نظاموں کو قبول کیا، تم اپنے تئیں پاک اور برگزیدہ سمجھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ جو کچھ تم سے صادر ہو جائے وہ سب پاک و پاکیزہ اور اللہ اور دین کا کام ہو جاتا ہے، اس کا خدا کے حکموں کے مطابق ہونا ضروری نہیں، تم نے خدا کے نبیوں میں تقسیم کر رکھی ہے ایک گروہ کو

مانتے ہو، دوسری جماعت کا انکار کرتے ہو، اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنی ہدایت، اپنے طریقے، اپنے انبیاء اور اپنی قوم کو مرکز ہدایت قرار دیتے ہو، مدعی ہو کہ تمہارے لیے ہمیشگی کا عذاب نہیں ہے، کچھ بھی کرو، تھوڑی سی سزا بھگت کر تقرب الٰہی کے مقام عالی پر سرفراز ہو جاؤ گے، تم سحر، شعبدہ، رمل، جفر اور علوم سفلیہ پر ایمان رکھتے ہو، تم ان لیڈروں اور کاہنوں پر ایمان رکھتے ہو جن کی باتیں اللہ کی ہدایت سے الگ ہیں اور جو شیطان کے پیرو اور خود طاغوت ہیں، تم شرک کے حامی ہو اور مشرکوں کے طریقہ کو اہل ایمان کے طریقہ پر ترجیح دیتے ہو، یہ ساری باتیں توحید اور اخلاص کے منافی ہیں۔

تمہارا دعوائے توحید بھی باطل ہے تم تحاکم الی الطاغوت کے مجرم ہو، تم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہو جو اللہ اور رسول کی ہدایت سے منحرف ہیں، تم رسول کو یا تو اعتقاداً واجب الاطاعت نہیں مانتے یا عملاً یا دونوں طرح، حالانکہ خدا کی اطاعت بغیر رسول کی اطاعت کے ممکن نہیں اور خدا کی عبادت کا دعویٰ بغیر اس کی اطاعت کے جھوٹا ہے، توحید کی لازمی شرط یہ ہے کہ اپنے تئیں بالکلیہ رسول کے حوالہ کرو، اس کی پوری پوری اطاعت کرو، اپنے سارے معاملات میں اُس کی طرف رجوع کرو اور اس کے فیصلوں کو بے چون و چرا مانو۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم پر نکتہ چینی کرتے ہو یا اپنے دلوں میں اس پر اعتراضات چھپائے ہوئے ہو اور اس کے متعلق شکوک و شبہات اور تذبذب و تردّد رکھتے ہو۔ اللہ اور رسول نے اہل ایمان کے لیے جو طریقہ ٹھہرایا ہے اس سے انحراف کرتے ہو۔ رسول کی پیروی صرف اپنے فوائد دنیوی کی حد تک کرنا چاہتے ہو۔ تم اپنے دنیوی مفاد اور اپنی شخصی دل چسپیوں اور اپنے خون کے رشتوں اور حلیفانہ روابط کو اللہ اور رسول اور اس کے دین سے عزیز تر رکھتے ہو، یہ ساری باتیں شرک ہیں اور اللہ تعالیٰ شرک کو کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔

باب ۶

موجودہ دنیا کا سرسری جائزہ

اب ہمارے پاس وہ روشنی موجود ہے جس کو لے کر ہم دنیا کے جائزہ کے لیے نکل سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ قوموں، بالخصوص ''متمدن'' قوموں کا شرک و بت پرستی کے اعتبار سے کیا حال ہے، لیکن اس کتاب کے ہر باب میں غایت درجہ اختصار ملحوظ ہے، اس لیے ہم اولاً تو صرف سرسری اشارات پر کفایت کریں گے، ثانیاً ہر مذہب کے پیروؤں کی صرف موجودہ حالت کو سامنے رکھیں گے، ان کے مذاہب کی اصل حقیقت سے بحث نہیں کریں گے، ثالثاً صرف ان قوموں سے تعرض کریں گے جو تمدنی اعتبار سے کچھ اہمیت رکھتی ہیں، ورنہ یہ حکایت اتنی دراز ہو جائے گی کہ اس کو سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔

بحث کی آسانی کے لیے ہم پہلے مشرق بعید کی اقوام اور بدھ مذہب کے پیروؤں کا جائزہ لیں گے، پھر ہندوستان کو دیکھیں گے، اس کے بعد ایک طرف مغربی یورپ اور امریکہ کا، اور دوسری طرف روس کا جائزہ لیں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ تہذیب جدید کے ان برقعوں کے اندر شرک کی کیسی گھنونی اور مکروہ شکلیں چھپی ہوئی ہیں اور علم تحقیق کے مدعیوں کے اس دعوے کے باوجود کہ اب شرک دنیا سے ناپید ہو چکا ہے، وہ کیسی حیرت انگیز وسعت کے ساتھ پورے کرہ ارض پر چھایا ہوا ہے۔

مشرق بعید

مشرق بعید کی اقوام کا غالب حصہ عموماً چار مذہبوں کا پیرو ہے: شنٹو مذہب، تاوی مذہب (TAOISM) کنفیوشزم اور بدھ مذہب۔

جاپان کا اصلی مذہب شنٹو مذہب ہے، ویسے تو جاپان کی سرزمین پانچ سو مذاہب کی سرزمین کہی جاتی ہے، لیکن اس کا قدیم ترین اور جدید ترین مذہب، شنٹو مذہب ہے، چھٹی صدی کے اواخر میں کوریا کے راستے سے بدھ مذہب بھی وہاں داخل ہو گیا تھا اور نویں صدی میں جاپان میں قومیت کی جو زبردست تحریک اٹھی، اس نے ملک کے اس قدیم مذہب کو پھر زندہ کر دیا اور اس کے بعد سے اب یہی جاپان کا سرکاری اور قومی مذہب ہے۔

اس مذہب کا خاص اصول نیچر اور بزرگوں کی پرستش ہے اس میں کوئی اسی لاکھ دیوی دیوتا ہیں، لیکن خاص الخاص سورج کی دیوی ہے، جس کا پوتا جاپانیوں کے خیال کے مطابق جاپان کا پہلا حکمران ہوا، اسی سے جاپان کا تخت حکومت یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا ہوا موجودہ میکاڈو کو ملا ہے۔ اسی سورج کی دیوی کی نسل ہزار ہا برس سے جاپان پر حکمرانی کر رہی ہے اگرچہ اس مذہب میں سمندر کی دیوی، ندیوں کی دیوی، پہاڑوں کی دیوی، آگ کی دیوی، غرض بے شمار دیویاں تسلیم کی جاتی ہیں اور قوم کے جانباز سپاہیوں اور شاہی خاندان کے وفادار خادموں کی بھی پرستش ہوتی ہے لیکن شنٹو مذہب کا اصل الاصول شاہی خاندان کی سب سے پہلی بزرگ دیوی اور اس کے رشتہ داروں اور اس کی اولاد کی پوجا کرنا ہے۔

چین کا بڑا حصہ تاوی مذہب، کنفیوشنزم اور بدھ مذہب کا پیرو ہے، قدیم زمانوں سے آباء واجداد اور بھوتوں اور شیطانوں، دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش ان مذاہب کی اصلی خصوصیت رہی ہے، مقدم الذکر دونوں مذہب آباء پرستی اور نیچر پرستی کو اصولاً تسلیم کرتے ہیں، بدھ مذہب اگرچہ اصلاً آباء پرستی کا حامی نہیں ہے، لیکن چین میں پہنچ کر وہاں کے قدیم مذہب نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور اب یہ تینوں مذاہب چین کی آباء پرستی مظاہر پرستی اور شیاطین پرستی کے مذہب ہیں، جادو منتر، سحر، شعبدے ان کی مشترک خصوصیت ہیں اور ان کے پیروؤں کے اوہام وخرافات کی داستان اتنی طولانی ہے کہ پڑھنے والا تھک جاتا ہے۔

تاوی مذہب کا بانی لاوتزے ہے، اس کا اصلی فلسفہ نفی کا فلسفہ ہے اس کا مذہبی صحیفہ مشکل

سے مرقس کی انجیل کے نصف کے برابر ہوگا، لیکن اس مذہب کے پیروؤں نے بعد میں اس پر جن اوہام کا اضافہ کیا ہے ان کی تفصیلات ضخیم مجلدات میں بھی نہیں سما سکتیں، تاوی فقراء ۱۰۰ قبل مسیح سے مشرقی سمندر میں پریوں کے ایک ایسے جزیرہ کے سراغ میں سرگرداں ہیں جہاں شجرۃ الخالد اگتا ہے، انہوں نے سارے آسمان کو دیویوں اور دیوتاؤں سے اور ساری زمین کو جادوگروں اور شعبدہ بازوں سے بھر دیا ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اگر اپنے احساسات کی نفی اور جاوداں زندگی کا راز پا جائے تو آسمانی دیوتاؤں کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کی آسمانی دیویوں میں ''آسمان کی ملکہ'' یا ''مقدس ماں'' کو سب سے زیادہ عظمت و اہمیت حاصل ہے، یہی سمندروں کی دیوی اور موجوں اور طوفانوں کی ملکہ ہے، ہر چینی ملاح، ہر ماہی گیر، ہر جہاز ران اور ہر بحری سیاح کی یہ محافظ ہے جب سمندر میں کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو اس کی دہائی دی جاتی ہے اور وہ فوراً آسمانوں میں نمودار ہو کر بڑے بڑے طوفانوں کو اپنی تلوار سے دفع کر دیتی ہے، سمندر کی تاریکیوں میں گم کردہ راہ جہاز رانوں کی رہنمائی کے لیے یہ سرخ لالٹین لے کر نمودار ہوا کرتی ہے۔

کنفیوشنرم کا بانی کنفیوشس ہے، چین کا اصلی مذہب آباء پرستی ہے اور کنفیوشنرم کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ آباء پرستی کے لیے ایک سند تصدیق ہے، آباء پرستی چینی میتھالوجی کی ریڑھ کی ہڈی ہے، ان کے ہاں سب سے زیادہ عظمت و اہمیت مردوں کی ارواح کو حاصل ہے، چین کی اصلی خدائی انہیں کے ہاتھ میں ہے، یوں تو چینی اپنے سارے دیوتاؤں ہی کو قربانیاں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ صدق دل کے ساتھ وہ اپنے باپ دادا کی روحوں کی عبادت کرتے ہیں۔

چینی عقیدہ کے مطابق مُردوں کی روحیں زمین پر باقی رہتی ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ان کو کھلایا پلایا نہ جائے، ان کو راضی نہ رکھا جائے اور ان کی عبادت نہ کی جائے تو وہ خفا ہو جاتی ہیں اور ان کی خفگی بہت سی آفتیں لاتی ہے، ان کے عقیدہ کے لحاظ سے جس شخص کی روح کی اس کی اولاد کی طرف سے تعظیم اور پرستش نہیں کی جاتی وہ روح ایک ابدی

شقاوت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

چین میں فرد کی انفرادی ہستی کا تصور معدوم ہے، ہر فرد اپنے آباء واجداد کے اس طویل سلسلہ کے ساتھ مربوط سمجھا جاتا ہے جو ابتدائے آفرینش سے لے کر خود اس کے وجود تک پھیلا ہوا ہے، ہر زندہ چینی کی ہستی یکسر مُردوں کی ارواح کے رحم و کرم پر منحصر ہے، اگر مردوں کی تعظیم، تمام مراسم مقررہ کے مطابق بجالانے میں معمولی کوتاہی بھی ہو جائے تو بس قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

ہزار ہا برس گزر چکے ہیں، چینیوں کے آباء واجداد دور حجری کی بدویانہ زندگی سے نکل کر دور جدید کی حضری زندگی میں داخل ہو چکے، پچیس شاہی خاندان ملک پر حکومت کر چکے، خوفناک جنگوں اور عظیم الشان انقلابات نے ملک کے آسمان و زمین بدل دیے ہیں، لیکن چین کی آباء پرستی روز اوّل سے آج تک بدستور قائم ہے اس میں سرمو تغیر نہیں ہوا۔

کنفیوشس نے بہت سے عمدہ اخلاقی اصولوں کی بھی تعلیم دی ہے، لیکن اس کی تمام تعلیمات کی بنیاد آباء پرستی پر ہے، وہ کہتا ہے کہ ہمیں اپنے آباء واجداد کے لیے ان کو حاضر و ناظر سمجھ کر قربانیاں پیش کرنی چاہئیں، ہمیں ارواح کی اس طرح عبادت کرنی چاہیے، گویا وہ ہمارے اندر موجود ہیں۔

اگرچہ اس نے کہیں اپنی تعلیمات میں اپنے خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے، لیکن ملک کے ہمہ گیر مذہب اور مذکورہ تعلیمات کی بدولت مرنے کے بعد وہ خود بھی لاتزے کی طرح ایک دیوتا بن گیا اور آج چین میں ایک بڑے دیوتا کی حیثیت سے اس کی بھی عبادت ہوتی ہے۔

بدھ مذہب کی جائے پیدائش ہندوستان کی سرزمین ہے، لیکن برہمنوں نے اس کو اس ملک سے اس طرح نکالا کہ پھر اس نے ادھر کا رخ کرنے کی جرأت نہیں کی، یہاں سے جلاوطن ہونے کے بعد اس کو ہندوستان کے مشرقی جزائر، برما، چین، جاپان، تبت وغیرہ میں پناہ ملی اور اب جاپان کے سوا، جہاں سترھویں صدی کی تحریک قومیت سے اس نے

شکست کھائی، تقریباً ہر جگہ نمایاں حیثیت میں موجود ہے اور چین و تبت وغیر میں اس کے پیروؤں کی ایک عظیم تعداد پائی جاتی ہے۔

گوتم بدھ کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ خدا کا قائل نہیں تھا لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، دنیا کی قدیم تاریخ ہمیں مشرکوں سے تو بھری نظر آتی ہے لیکن خدا کے منکروں کا کہیں بھی کوئی نشان نہیں ملتا، خدا کا انکار کرنے والے اگر کچھ بلید ملتے ہیں تو صرف موجودہ دور میں ملتے ہیں، گوتم بدھ جیسے فلسفی کے متعلق کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کا منکر ہوگا؟ ہم نے گوتم بدھ کے عہد کی تاریخ اور اس کے مذہب کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ گوتم بدھ سے پہلے ہندوستان میں اپنیشدوں کے ذریعے سے وحدت الوجود کا فلسفہ اچھی طرح پھیل چکا تھا۔

وحدت الوجود کے قائل کے لیے خدا کے اقرار و انکار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کے نزدیک ''انا'' کے سوا تمام کائنات وہم و فریب ہے۔ یوگی کا کام یہ ہے کہ وہ زندگی اور موت کے چکر اور مایا کے جال سے چھوٹ کر روح کائنات یا بالفاظ دیگر ''انا'' میں ضم ہو جائے، گوتم بدھ کے دور سے پہلے ہندو جوگیوں کی ریاضتوں کی جو تاریخ ہمیں ملتی ہے وہ تمام اسی عقیدہ کا مظاہرہ ہے وہ طرح طرح کی خوفناک ریاضتوں کے ذریعہ سے مایا کے جال سے نکلنے اور روح کائنات میں ضم ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، جب گوتم بدھ کی آنکھیں کھلیں اور نجات کے لیے اس کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی تو اس کے سامنے بھی یہی فلسفہ آیا اور اس نے برہمنوں ہی کے طریقہ پر زندگی اور موت کی کشاکش اور خواہشوں کے جنجال سے نکلنے کے لیے نہایت جاں گسل ریاضتیں شروع کیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے تجربہ کے بعد اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ مادیت کے غلاف سے نکلنے کے لیے یہ ہولناک ریاضتیں غیر ضروری ہیں، اصل شے نفس کا خواہشوں سے پاک ہونا اور روح و دل کا محسوسات کی محبت سے آزاد ہونا ہے، چنانچہ جہاں تک تکلیف دہ ریاضتوں کا تعلق ہے، اس نے برہمنوں کے طریقہ کی اصلاح کر دی اور تزکیۂ نفس اور تجرد کے حصول کے لیے ایسے

ضابطے بنائے جن میں ظاہری ترک سے زیادہ باطنی ترک پر زور دیا گیا۔

وحدت الوجود کی آخری تان ''انا اللہ اور انا الحق'' ہے، چنانچہ اسی چیز نے ہر ہندو یوگی کو عبد کے بجائے طاغوت بنا دیا گوتم بدھ کی جدوجہد بھی اسی مقصد کے لیے تھی، چنانچہ وہ بھی اپنے خیال کے مطابق مادیت کا جامہ اتار کر روح کائنات میں ضم ہو گیا، اس کے مرنے کے بعد اس کے معتقدین نے اس کو خدا بنا دیا اور اس کی ولادت سے متعلق بہت سے بے سروپا افسانے پھیلا کر اسے ایک اوتار کی حیثیت سے پیش کیا، جو دنیا کو نئی زندگی بخشنے آیا تھا، اب چین، جاپان، تبت، برما، وغیرہ میں اس کی پرستش خدا کی حیثیت سے ہوتی ہے اور اس کے شاندار مندر اور عظیم الشان بت دیکھنے والوں پر حیرت طاری کر دیتے ہیں، چین میں اس کے پرستار ہر قسم کے بھوتوں اور دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستشوں میں مبتلا ہیں، تبت وغیرہ میں اور بھی برا حال ہے، تبت کا سب سے بڑا پیشوائے مذہبی ـــــ دلائی لامہ ـــــ خود گوتم بدھ کا اوتار خیال کیا جاتا ہے اور اسی طرح خدائی کرتا ہے جس طرح گوتم بدھ، وہاں کا دلائی لامہ جب مرتا ہے تو ہر حاملہ عورت ایک نیا خدا جننے کی آرزو سے معمور ہو جاتی ہے اور اس دور میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں، قرعہ اندازی کے ایک خاص طریقہ سے، ان میں سے ایک نئے الٰہ کا انتخاب ہوتا ہے۔

ہندوستان

ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے جی ڈرتا ہے، یہاں کا ہر ذرّہ دیوتا ہے، چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک اور ذرّہ سے لے کر آفتاب تک، سب یہاں معبود اور مقدس ہیں، دریا، پہاڑ، شجر، حجر، چرند، پرند، بلی، چوہے یہاں تک کہ ناقابل ذکر انسانی اعضاء تک کے پرستار یہاں مل جائیں گے۔

ویدوں میں ہمارے سامنے سب سے پہلے ''ہزار چشم'' اندر آتا ہے، جس نے اپنے عملی

نمونہ سے اپنے پرستاروں کو ''بدمستی'' اور نشہ بازی کی تعلیم دی، اس کے بعد برہما وشنو اور شیو کی تثلیث نظر آتی ہے، مقدم الذکر خالق ہے، ثانی الذکر محافظ ہے اور تیسرا مارنے والا اور جلانے والا ہے۔

برہما اپنے ہر کلپ کے بعد دنیا کو فنا کر کے از سر نو وجود بخشتا ہے، اس کا مندر آج تک راجپوتانہ میں مرجع خلائق ہے۔

وشنو جب دنیا پر کوئی بڑی آفت آتی ہے تو خلق کی نجات کے لیے اترتا ہے اس مقصد کے لیے وہ بار بار اوتاروں کی صورت میں جنم لیتا ہے، اس کے دس اوتار ہندو میتھالوجی میں مشہور ہیں سری کرشن بھی وشنو کے اوتار خیال کیے جاتے ہیں اور ان کی زندگی کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے، اور اس سے جو مذہبی روایات ہندو قوم میں پھیلی ہوئی ہیں ان کے بیان سے بھی شرم آتی ہیں۔

شیو، وشنو کا حریف مقابل ہے، یہ ایک ہی ساتھ دو متضاد فطرتیں رکھتا ہے، اس کے قبضۂ قدرت میں تعمیر و تخریب دونوں ہیں، اس کے اندر عورت اور مرد دونوں کی خصوصیات جمع ہیں۔

اس کے بعد ہمارے سامنے پتنجلی کا فلسفہ یا ہندو تصوف آتا ہے، اس کی بنیاد وحدت الوجود پر ہے، اس فلسفہ میں موجود صرف ''انا'' ہے، اس کے ماسوا سب وہم و فریب ہے اس کی غایت یہ ہے کہ ذرہ آفتاب، قطرہ دریا اور بندہ خدا بن جائے، اس کا راستہ یہ ہے کہ ریاضات شاقہ کے ذریعہ سے روح کو مادہ سے مجرد کیا جائے، اس مقصد کے لیے ہندو یوگیوں اور فقیروں نے جو طریقے پیدا کیے ہیں ان کی تفصیلات سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور اس کے لیے عملاً انہوں نے جو کچھ کر دکھایا ہے اس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو انسان اپنے معمولی مقاصد کے لیے جان کی بازی کھیل جایا کرتا ہے، وہ خدا بننے کے لیے جو کچھ بھی کر گزرے کم ہے، چنانچہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان ہندو جوگیوں نے جس طرح کی ریاضتیں کی ہیں اس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں مشکل سے

مل سکیں گی لیکن یہ سب کچھ خدا کی بندگی کے لیے نہیں کیا گیا، بلکہ خدا بننے کے لیے کیا گیا۔

دیوتاؤں کے بعد ہندو میتھالوجی میں دیویوں کی باری آتی ہے اور ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے، ان سب کی خصوصیات کی تفصیل میں پڑنا تو لاحاصل ہوگا، البتہ لکشمی دُرگا، بھیروی اور کالی مائی کے نام ہم یاد دلائے دیتے ہیں، بالخصوص ان میں سے موخرالذکر کو ہندوؤں کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل ہے، چیچک، ہیضہ، وغیرہ جیسی خطرناک بیماریاں سب انہی کی غضب ناکیوں کے مظاہر ہیں۔

ہندوؤں کے اندر جس قدر بھی فرقے ہیں وہ یا تو ان دیویوں اور دیوتاؤں کے پرستار ہیں یا گیتا اور پتنجلی کے فلسفہ سے متاثر ہیں، بعض فرقے کس قدر مختلف نظر آتے ہیں، لیکن ان کا اختلاف محض ظاہری ہے، حقیقت اور مغز کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، صرف دو فرقے کسی قدر مستثنیٰ حالت رکھتے ہیں، ایک آریا سماجی، دوسرے سکھ، یہ دونوں اسلام سے متاثر ہوئے ہیں، اور توحید کے مفہوم سے کس قدر قریب آئے ہیں لیکن اسلام سے ان کی قربت ایک دفاعی جذبہ کے تحت وجود میں آئی ہے، اس وجہ سے اس قربت کے باوجود وہ اسلام سے دور ہی ہیں، ان فرقوں کے بانیوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ مسلمانوں کا مقابلہ بت پرستی پر قائم رہ کر مشکل ہے اس لیے انہوں نے مورتیوں وغیرہ کی پوجا ترک کر کے فی الجملہ ایک ایسی اصلاح قبول کر لی جس کے بعد وہ اپنے خیال کے مطابق روح زمانہ اور عقل سے قریب آ گئے اور اپنے تئیں اس قابل خیال کرنے لگے کہ اب وہ مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کو مسلمانوں سے جو عداوت ابتدا سے ہے وہ کسی اور فرقہ کو نہیں ہے حالانکہ ان کو مسلمانوں کے اصل الاصول سے قریب ہونے کی وجہ سے ان سے محبت کرنی چاہیے تھی۔ بہرحال یہ اصلاح انہوں نے کسی جذبہ کے تحت قبول کی ہو، ایک اہم اصلاح ہے اور اس کی وجہ سے وہ اسلام کی بنیادی تعلیم سے قریب آ گئے ہیں، اب ان کو توحید اور اس کے مقتضیات کی تعلیم دنیا آسان کام ہے، بشرطیکہ حق ان کے سامنے اس راستے سے آئے جو اس کا اصلی راستہ ہو۔

مذہب پرست ہندوستان کا یہ حال ہے، عوام و خواص سب اسی طرح کے توہمات مشرکانہ میں گرفتار ہیں، یہاں کے اچھے دماغوں پر گیتا کے وحدت الوجود کا تسلط ہے جو بجائے خود ایک عظیم فتنہ ہے، آریوں اور سکھوں کی آخری معراج یہ ہے کہ مورتی پوجا کے منکر ہیں، لیکن ہمارے اوپر کے مباحث پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ حقیقی توحید تک پہنچے کے لیے ابھی ان کو بہت سے مرحلے طے کرنے باقی ہیں۔

جس طرح ہندوستان پر مسلمانوں کے غلبہ کے اثر سے سکھ اور آریہ سماجی وجود میں آئے اسی طرح انگریزوں کے غلبہ اور مغرب کے جدید افکار و نظریات کے اثر سے ایک نیا گروہ وجود میں آیا جو فی الجملہ زیادہ ترقی یافتہ ہے، اس نے بہت حد تک قدیم ہندو میتھالوجی کے توہمات سے اپنے دماغ کو آزاد کرلیا ہے، لیکن یہ ایک دوسری میتھالوجی تیار کررہا ہے، جس کا مواد اس نے مغرب سے لیا ہے، اس میں پرانے دیوتاؤں اور دیویوں کی جگہ نئے دیوی دیوتا ہیں، اس میں انسان خود اپنا الٰہ ہے، خود اپنے لیے قانون بناتا ہے، خود اپنے اوپر فرمانروائی کرتا ہے اور خدا کی زمین پر اپنی بادشاہی کا ڈنکا بجاتا ہے اس کا نام ڈیموکریسی ہے۔

مغربی یورپ اور امریکہ

مغربی یورپ اور امریکہ کا اصلی مذہب عیسائیت ہے، عیسائیت کے بگاڑ کی ابتدائی تاریخ ہم پچھلے صفحات میں بیان کرچکے ہیں، نیسیہ کی کونسل کے بعد سے تثلیث کا عقیدہ باضابطہ سٹیٹ کا مذہب بنا اور پوپ اور کلیسا کی خدائی کا دور شروع ہوا، نیز ہم یہ واضح کرچکے ہیں کہ مذکورہ بالا کونسل کے بعد آریوس اور اس کی پارٹی جو حضرت مسیح علیہ السلام کے سچے خلیفہ پیٹر ـــــ شمعون صفا ـــــ کے عقائد کی وارث اور صحیح نصرانیت کی حامل تھی، نہایت اقلیت، بلکہ مظلومیت و مقہوریت کی حالت میں آگئی [1] اور پال کی باطنیت اور تحریفات کی

---

[1] اسی پارٹی کے بقیات صالحات تھے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے اور ان ہی لوگوں کی قرآن نے جگہ جگہ تعریف کی ہے، نہ کہ پال کی متبعین کی جو ہمیشہ توحید دشمنی کے سرخیل رہے ہیں۔

بنیاد پر کلیسا کے رسوم وعقائد کی عمارت کھڑی ہوئی۔

اب ہمیں ایک سرسری نظر بیچ کی صدیوں سے لے کر اصلاح کلیسا (RE FOR MATION) کے عہد تک کی تاریخ پر ڈالنی ہے۔

اس بیچ میں ہمیں دو باتیں نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، ایک کرسچین چرچ کی وحدت، دوسری اس کا ہمہ گیر اقتدار، قرون متوسطہ میں کلیسا کا اقتدار ایسا غالب اور ہمہ گیر ہوگیا تھا کہ تمام چھوٹی بڑی سلطنتیں اس کے ہاتھ میں بالکل ایک آلۂ بے جان بن کر رہ گئی تھیں اور اس کے آگے مقدس رومی شہنشاہی کا جاہ وجلال بھی ماند پڑ گیا، لیکن کلیسا نے اس کے اقتدار سے نہایت غلط فائدہ اٹھایا، اس اقتدار کے نشہ میں اس نے وہ جنگ صلیبی شروع کر دی، جس نے دوسو برس تک پورے یورپ کو زیروزبر رکھا، اس دوران میں خداوندان کلیسا نے جو جرائم کیے، جس طرح خلق خدا کا بے دریغ خون بہایا، جس طرح نوخیز بچوں تک کو جنگ کے نشہ سے سرشار کر کے تباہ کیا، جس طرح وقت کی تمام تعمیری قابلیتوں کو تخریب کی راہ پر ڈال دیا، اس کا ردعمل اہل یورپ کے دماغوں پر کلیسا کے خلاف ہوا۔ جنگ کی ناکامیابیوں اور تباہ کاریوں نے اہل فکر کے دماغوں میں ایک بحران سا پیدا کر دیا، ہر شخص کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ارباب کلیسا کا اقتدار دنیا کی تباہی کا سبب ہے، علم وتحقیق کے شیدائیوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ کلیسا تمام ذہن وفکر پر کابوس کی طرح مسلط ہوگیا ہے اور جب تک یہ کابوس دور نہ ہوگا اس وقت تک فکر ونظر کی تمام راہیں مسدود رہیں گی، ارباب سیاست یہ سوچنے لگے کہ حکومتوں پر کلیسا کا اقتدار بالکل خلاف عقل اور خلاف فطرت ہے، سیاست کو مذہب سے بالکل بے تعلق ہونا چاہیے، یورپ کی مختلف قومیں محسوس کرنے لگیں کہ رومن کیتھولک چرچ دنیا پر رومی اقتدار کا ایک بہانہ ہے، اس کو ختم ہونا چاہیے، یہاں تک کہ خود کلیسا کے اندر ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی، جس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ہم مسیح علیہ السلام کی زندگی سے ہٹ کر دنیاداری کی تمام شیطنتوں میں مبتلا ہوگئے ہیں اور ہمارا مقصد اب صرف دولت کے انبار اکٹھا کرنا اور اپنے عظمت وجلال کی نمائش کرنا اور دنیا کو تباہ کرنا

رہ گیا ہے، ہمیں غربت کی زندگی، خدمت خلق، ترک دنیا اور اتباع مسیح کی طرف لوٹنا چاہیے۔

ان تمام چیزوں نے مل ملا کر یورپ میں وہ بحران کا دور پیدا کر دیا جس کو ہم نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کے نام سے جانتے ہیں، بیکن وغیرہ جیسے اہل علم، میکیاولی اور ہیوگو گروٹیس وغیرہ جیسے ارباب سیاست، گارڈینو برونو جیسے آزاد خیال مفکرین اسی بحرانی دور کی پیداوار ہیں، کلیسا نے ان لوگوں کی مخالفتوں کا جواب مذہبی جرائم کا فیصلہ کرنے والی عدالتوں (INQUISITIONS) سے دیا اور مذہبی وسیاسی اصلاح کے داعیوں اور علم وتحقیق کے شیدائیوں کو ایسی خطرناک سزائیں دیں کہ ان کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، لیکن ان سزاؤں نے کلیسائی کی مخالفت اور پاپائیت کے ختم کرنے کے مطالبہ کو اور زیادہ قوی کر دیا، مختلف قوموں میں اپنی قومیت کے تحفظ کا جذبہ تیز سے تیز تر ہو گیا، ارباب علم کا جوش تحقیق واکتشاف قوی سے قوی تر ہو گیا اور فلسفہ نے تو گویا سر جوڑ کے کلیسائی توہمات کی بیخ کنی کا عزم کر لیا اور خود کلیسائی حلقہ کے اندر اصلاح اور تبدیلی کا مطالبہ درجہ بدرجہ اتنا قوی ہو گیا کہ سولہویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے وائی کلف ہس اور لوتھر جیسے زبردست حامیان اصلاح پیدا ہو گئے اور انہوں نے متحدہ کرسچین چرچ کو پھاڑ کر دو حصوں میں بانٹ دیا اور باضابطہ پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈال دی، جس کا بنیادی تخیل یہ تھا کہ مسیحؑ اور خدا کے درمیان کسی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے، انجیل کے سمجھنے اور مراسم مذہبی کے بجالانے کا حق ایک عام آدمی کو بھی اسی طرح حاصل ہے جس طرح پاپائے روم کو۔

قومی حکومتوں کا آغاز تو تیرہویں صدی ہی میں ہو چکا تھا، سولہویں اور سترہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے نیشنلزم، متحدہ قومیت، مذہب اور سیاست کی علیحدگی اور مذہبی رواداری کا زور اس قدر بڑھا کہ کلیسا کو، خواہ وہ کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ، اپنا تمام کاروبار سمیٹنا پڑا۔ علم وسیاست اور معاش ومعیشت کے تمام گوشے چرچ کے تسلط سے یک قلم آزاد ہو گئے، اور اس کی جگہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی وہ سیاسی تنظیمات وجود میں آ گئیں جن میں مذہب پرائیویٹ زندگی کا ایک مشغلہ رہ گیا اور اجتماعی زندگی پر احبار ورہبان کی خدائی کی

جگہ عوام الناس اور پارلیمنٹوں کی خدائی شروع ہوگئی۔

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہوگیا کہ عیسائیوں کو خالص خدا پرستی کی سعادت کبھی حاصل نہیں ہوئی، پال نے ان کو مسیحؑ، مریمؑ، کاہن اعظم اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا کیا اور رومن کیتھولک چرچ کا مشرکانہ خرافات کا دروازہ کھولا اور لوتھر کی اصلاحات نے کلیسا کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے اس کی جگہ عوام الناس، پارلیمنٹوں کے ممبروں، بادشاہوں اور پریذیڈنٹوں کو بخش دی اور اس طرح پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے الگ الگ ارباب بنا لیے گئے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے جب جمہوریتوں کا ضعف واضح کیا تو یورپ کے بعض ممالک میں ڈکٹیٹرشپ کا آغاز ہوا، جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ میں فرق صرف ارباب کی تعداد کا ہے، جمہوریت میں بہت سے الٰہ مل کر قانون بناتے اور خدائی کرتے ہیں، ڈکٹیٹرشپ میں صرف ایک الٰہ اپنے شرکاء و اعوان کی مدد سے خدائی کرتا ہے۔

روس

روس میں اشتراکیت کا دور دورہ ہے، اشتراکیت جمہوریت کا آخری قدم ہے، جمہوریت نے مذہب اور خدا کو پرائیویٹ زندگی کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا، اشتراکیت نے یہ رشتہ بھی کاٹ دیا، انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر انسان کی حاکمیت کو مسلط کر دیا۔ وہاں عیسائی تثلیث کی جگہ مارکس، لینن اور سٹالن کی تثلیث ہے، ان اقانیم ثلاثہ نے جو نظام عقائد، جو نظام اخلاق اور جو نظام معاش و معیشت وضع کر دیا وہی روس کا دین ہے۔

باب ۷

مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ

یہ تو ان گروہوں کے شرک کا حال تھا اور ہے جو شرک دشمنی کے مدعی بھی نہیں ہیں، اب ہمیں اس گروہ کی حالت دیکھنی ہے جو خالص توحید کی بنیاد پر بنا تھا اور جس کے قیام کی واحد غرض ہی یہی تھی کہ دنیا سے شرک کو مٹا کر توحید قائم کرے۔

یہ امر بالکل قطعی ہے کہ محل کے بدل جانے سے کسی شے کی حقیقت نہیں بدل جاتی، جو چیز مشرکین کے اندر شرک ہے، منافقین کے اندر شرک ہے، وہی چیز اگر مسلمانوں کے اندر پائی جائے گی تو وہ توحید نہیں بن جائے گی، شرک ہی رہے گی، نجاست کسی ٹھیکرے میں ہو یا سونے چاندی کے کسی خوشنما ظرف کے اندر، دونوں جگہ نجاست ہے۔ اس تبدیلی سے اس کی حقیقت و ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، البتہ حالات کی تبدیلی سے اس کا حکم ضرور بدل جائے گا، خنزیر و خمر نجس ہیں اور ہر حال میں نجس ہیں، لیکن ایک مضطر و مجبور اگر جان بچانے کے لیے بقدر سدِ رمق ان میں سے کچھ کھا لیتا ہے تو شریعت اس پر گرفت نہیں کرتی، پس ایک چیز ہے واقعہ اور ایک چیز ہے حالات کی تبدیلی کے اعتبار سے اس کا حکم، اس باب میں ہم صورت واقعہ کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد والے باب میں اس کا حکم بیان کریں گے۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت کا اگر جائزہ لیا جائے اور بے جا غرور اعتراف حق سے مانع نہ ہو تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عرب جاہلیت سے لے کر منافقین تک شرک کی جتنی قسمیں بیان ہوئی ہیں، اگر وہ سب نہیں تو ان کا بڑا حصہ مسلمانوں کے اندر موجود ہے، صرف شکلیں بدلی ہوئی ہیں۔ عرب جاہلیت کی جنات پرستی، طاغوت پرستی، قوم پرستی اور حمایت شرک، منافقین کی طاغوت پرستی، انا پرستی اور مفاد پرستی، ان تمام ''پرستیوں'' میں کون سی ''پرستی''

ہے جو آج مسلمانوں کے اندر موجود نہیں ہے۔

کتنے مسلمان ہیں جو علوم سفلیہ کی لعنتوں میں گرفتار ہیں، انہوں نے ٹونے ٹٹکے گنڈے تعویذ[1]، سحر اور طلسمات وغیرہ کو کسب معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے، تسخیر جن وشیاطین کے وظائف وعملیات کا علم ہی ان کے نزدیک اصلی علم ہے، جنات کی تسخیر کے لیے وہ طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں، چلہ کشی کرتے ہیں، نذریں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں، ان کو علم غیب کا وسیلہ سمجھتے ہیں، ان کو مستقل بالذات نافع وضار خیال کرتے ہیں، ان کی دہائی دیتے ہیں، ان کے تعلق سے خدا کی کتنی جائز چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں اور کتنی ناجائز باتوں کو جائز کر دیتے ہیں۔

اسی طرح کتنے ہیں جو علم اسماء اور خواص کلمات واشیاء کے چکر میں رہتے ہیں اور اس علم کو بعینہٖ اسی طرح کے برے مقاصد میں استعمال کرتے ہیں، جن میں ان کے پیش رو، یہود استعمال کرتے تھے، یہاں تک کہ بعض ظالموں نے خود قرآن عزیز کو بھی حب وبغض، تسخیر وتفریق اور وضع واستقرا، حتی کہ امساک کے عملیات کا دفتر بنا رکھا ہے۔ اس قسم کی عملیات کے خالق خدا کی نعمتوں کو بعض اوقات عارضی طور پر اور بعض حالات میں مستقلاً حرام کر لیتے ہیں، اس طائفہ کے بعض اشخاص کے سامنے جب میں نے ذکر کیا کہ اذن الٰہی کے بغیر کسی شے کو حرام وحلال کرنا شرک ہے تو ان کو بڑا تعجب ہوا۔

---

[1] احادیث نبوی سے جن تعویذوں کے لیے زیادہ سے زیادہ رخصت ملتی ہے، اولاً تو وہ خاص خاص حالات کے لیے ہیں، ثانیاً ان کی اصلی روح اللہ واحد سے استعاذہ، اس کی طرف تفویض اور غیر اللہ سے اظہار براءت ہے، باقی رہے وہ تعویذ جن میں لایعنی کلمات ہوتے ہیں اور جن میں شرک کی آمیزش کا ظن یا علم ہے، ان کے جواز کا شرع شریف میں کوئی امکان بھی نہیں ہے، لیکن یہ دیکھ کر نہایت قلق ہوتا ہے کہ تعویذ فروشی کی موجودہ دکانیں بیشتر ایسے ہی تعویذوں سے چل رہی ہیں، جو عموماً مشرکانہ اور غیر مفہوم عجمی الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں، اور اگر آیات قرآن سے بھی استعاذہ کیا جاتا ہے تو عموماً تحریف کر کے، ایک بزرگ نے خود مجھ کو بچھو کا ایک عمل بتانا چاہا، جس میں سورۂ ناس کے ہر لفظ کا آخری حرف غائب کر دیا گیا تھا، میں نے ان سے کہا: حضرت، قرآن کو مسخ کرنے کی ذمہ داری آپ ہی اٹھایئے، مجھے اس سے معاف ہی رکھیے تو میری اس ناقدری سے وہ مجھ سے بہت مایوس ہوئے۔

وباؤں کے زمانوں میں یا خاص خاص بیماریوں کے مریضوں کی موجودگی کی حالت میں کتنی چیزیں ہیں جو گھروں کے اندر اس ڈر سے استعمال نہیں کی جاتیں کہ جو ا رواح ان بیماریوں کا باعث ہیں ان کو ان چیزوں سے چڑ ہے اور ان کو دیکھ کر ان کا غضب اور بڑھتا ہے۔

نکھتروں، دنوں اور مہینوں اور کسوف و خسوف سے متعلق کتنے مشرکانہ توہمات ہیں جن میں عورتوں سے گزر کر عاقل مردوں تک کو ہم نے گرفتار پایا ہے۔

کتنے مسلمان ہیں جو آباء پرستی کی لعنتوں میں مبتلا ہیں، مشائخ اور بزرگوں کی قبریں گوشہ گوشہ میں موجود ہیں اور علانیہ ان کی پوجا ہو رہی ہے، ان پر نذریں پیش ہوتی ہیں، قربانیاں کی جاتی ہیں، چادریں چڑھائی جاتی ہیں، دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ مصائب اور نقصانات کو اصحاب قبور کی ناراضی پر محمول کیا جاتا ہے ان کی زیارت کے لیے لوگ دور دور کا سفر کر کے جاتے ہیں، ان پر مراقبہ کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں، اور دوسرے بے شمار محرمات کا ارتکاب کرتے ہیں، جن کا حرام ہونا شریعت میں معلوم ہے۔ تقرب الٰہی کے لیے ان کا وسیلہ ناگزیر خیال کیا جاتا ہے، بہتیرے ان کو سمیع و بصیر خیال کرتے ہیں، خطرات اور مصائب کے وقت ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں[1]۔ ان کو خدا کے ہاں سفارشی سمجھتے ہیں، ان سے دنیا کی کامیابی، مقدمات میں فتح، تجارت میں فروغ اور آل اولاد کی برکت مانگتے ہیں۔ ان کی خدمات میں مختلف اغراض و مقاصد کے لیے درخواستیں پیش کی جاتی ہیں، یہاں

[1] ایک ثقہ عالم دین شخصیت راوی ہیں کہ وہ ایک مرتبہ ایک ''اسلامی'' ریاست کے مفتی صاحب کے ساتھ موٹر پر جا رہے تھے، سامنے یکا یک ایک بچہ آ گیا۔ مفتی صاحب بے اختیار پکار اٹھے: ''یا غوث!'' انہوں نے دریافت کیا یہ آپ نے کس غوث کو مدد کے لیے پکارا؟ مفتی صاحب نے فرمایا: شیخ عبدالقادر جیلانی کو۔

ایک دوسرے بزرگ عالم دین نے ایک مرتبہ ایک عالم دین اور پیشوائے طریقت کے گہرے رنگ تصوف کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے بیان فرمایا کہ ہم اور وہ دونوں ٹم ٹم پر جا رہے تھے۔ راستہ میں گھوڑا بدکا اور ہم دونوں کے لیے سخت خطرہ پیش آ گیا اس وقت بے اختیار انہوں نے ''یا غوث!'' پکارا۔ میں نے بر سبیل مدح اس واقعہ کو سن کر اپنے دل میں ان دونوں صاحبوں کی حالت پر ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا۔

تک کہ بعض مزارات پر سائلین کی درخواستوں کو پیش کرنے کے لیے باضابطہ اہتمام ہے۔

کتنی مشرکانہ بدعتیں ہیں جو حضرات صحابہ کرامؓ، صحابیات عظامؓ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات رسول (رضی اللہ عنہن) کے نام سے موجود ہیں، ان کے نام سے خاص خاص پکوان پکتے ہیں اور ان کے کھانے میں اس قسم کی تفریقیں ملحوظ ہوتی ہیں جو مشرکین کے یہاں ملحوظ ہوتی تھیں[1]۔ اور جن کا قرآن نے سورۂ انعام میں ذکر فرمایا ہے۔

کتنے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفات میں شریک قرار دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں۔ حد یہ ہے کہ ؎

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر　　اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

کتنی جگہیں ہیں جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے تبرکات بتائے جاتے ہیں اور ان کی زیارت کی تقریبات مستقل فتنہ بنی ہوئی ہیں، بعض مقامات پر بزرگوں کی قبروں اور ان کے تبرکات کے صندوقوں یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان قدم کا غسالہ زائرین میں تقسیم ہوتا ہے اور لوگ اس کو بہت سے امراض روحانی وجسمانی کا واحد علاج سمجھ کر پیتے ہیں، آنکھوں میں لگاتے ہیں، داڑھیوں میں ملتے ہیں، محرم اور تعزیہ داری کی مشرکانہ بدعتیں ہر شہر اور دیہات میں موجود ہیں اور ان کا کم وبیش تجربہ ہر شخص کو ہے۔

کتنے ہیں جو اپنے نسب کو ذریعۂ نجات یا کم از کم ذریعۂ تقرب الٰہی سمجھتے ہیں، آباء کا طریقہ کتنوں کے یہاں دین وشرع کی حیثیت رکھتا ہے۔ شرع اور رواج کی اصطلاحیں ہر زبان پر چڑھی ہوئی ہیں اور شرع کے مقابل میں علی الاعلان رواج کو ترجیح دینے والے مسلمانوں کے ہر طبقہ میں موجود ہیں۔

دینی معاملات میں اللہ کی ہدایت کی تلاش اور طلب تقریباً بالکل مفقود ہے، مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقہ میں عوام سے گزر کر علماء تک ایسے غالی مل جائیں گے جو

---

[1] مثلاً یہ کہ فلاں نیاز کو مرد نہ کھائیں اور فلاں نیاز کو فلاں قسم کی عورت نہ کھائے اور فلاں نیاز صرف دن ہی میں کھائی جاسکتی ہے اور فلاں نیاز رات ہی کے وقت کھائی جاسکتی ہے۔

اپنے خاص طریقہ، اپنے مخصوص فرقہ کے علماء اور اپنے متعین امام پر اس طرح جامد اور ان کی عصبیت میں اس طرح گرفتار ہیں کہ ان کے دائرہ سے باہر ان کے لیے حق و ہدایت کا تصور بھی دشوار ہے، بعض غالیوں کا تو یہ حال ہے کہ نصوص کتاب وسنت کی قطع و برید پر زور صرف کر ڈالیں گے، لیکن اپنے امام کے کسی قول پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ بعض یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ یہ آیت اور یہ حدیث لازماً ہمارے امام کے سامنے رہی ہوگی، لیکن اس کے باوجود جب ان کا فتویٰ یہی ہوا تو ہم ان ہی کی پیروی کریں گے، آیت وحدیث کے اسرار کے سمجھنے کی ذمہ داری ان پر ہے۔

کتنے ہیں جو اللہ کے فضل سے دین کا علم بھی رکھتے ہیں، لیکن وہ حق کا معیار اپنے شیوخ واکابر ہی کو سمجھتے ہیں، ان کے شیخ جس مسلک پر ہوں، اس کا غلط ہونا ان کے نزدیک ناممکن ہے اور جس مسلک پر ان کے شیوخ نہ ہوں، اس کی صحت پر کتنے ہی دلائل اللہ کی کتاب سے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے، عقل سے، نقل سے جمع کر دیجیے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ جو عصبیت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہونی چاہیے وہ عصبیت ان کے اندر اپنے شیوخ واکابر کے لیے ہے اور جو حمیت اللہ کی ہدایت اور اس کے رسول کے طریقے کے لیے مطلوب ہے وہ حمیت ان کے اندر اپنے علماء اور ائمہ کے طریقے کے لیے ہے، اور اچھے خاصے ذہین لوگ بھی اس فتنہ کی اہمیت کو نہیں سمجھتے ہیں۔

اوپر مشرکین کی خود پرستی اور یہود کی قوم پرستی کا بھی ذکر ہوا ہے اور وہاں ہم نے دکھایا ہے کہ ایک متوارث عظمت دینی و دنیاوی کے بعد کس طرح قومیں اور جماعتیں خود طاغوت بن جایا کرتی ہیں، کس طرح وہ اللہ کے تمام وعدوں اور اس کی ساری برکتوں کو ایمان باللہ اور عمل صالح کی جگہ اپنے نسب اور خاندان سے وابستہ کر دیتی ہیں۔ کس طرح اپنے دائرہ کو نجات کا دائرہ اور اپنے طریقہ کو ہدی اللہ کا قائم مقام بنا دیتی ہیں، ٹھیک یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے، یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ سے آپ اسلامی ہو جاتا ہے اس کے لیے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے طریقے سے مطابق ہونا ضروری نہیں، یہ جو رنگ ڈھنگ

اختیار کرلیں وہ صبغۃ اللہ ہے، اگر چہ وہ مغرب کی جاہلی تہذیب کی بھونڈی نقالی ہی کیوں نہ ہو، یہ جو تعلیم اپنے بچوں کو دیں وہ اسلامی تعلیم ہے، اگر چہ وہ تعلیم بچے کے دل کے اندر سے اسلام کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دے، یہ جو ادارے قائم کردیں وہ اسلامی ہیں، اگر چہ ان کے اندر شب و روز اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا ہو۔ یہ جس اساس پر بھی اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرلیں اور جس شرع و آئین کو بھی اختیار کرلیں، ان کی اسلامیت کسی حال میں بھی ان سے جدا نہیں ہوسکتی، ترکیہ نے پرسنل لا سوئٹزرلینڈ سے، تعزیرات اٹلی سے اور قانون تجارت جرمنی سے مستعار لے لیا، تاہم اس کا ایک اہم ترین اسلامی حکومت ہونا مسلّم رہا اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامے انجام پائے وہ دین کے غازی، مجاہد اور محسن اعظم، سب کچھ سمجھے جاتے ہیں۔

اسی نقطۂ نظر کا غلبہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے چند مخصوص دائرے ایسے بنالیے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت حکومت کی مشینری اور مجالس قانون ساز میں حاوی رہی اور اجتماعی اور معاشرتی امور میں انہیں اپنے رنگ کو چمکانے کا موقع ملا۔ تو یہ دائرے پاکستان بن جائیں گے، اگر چہ حکومت کا نظام کسی جاہلی نظام کی نقالی ہی ہو، اور اگر چہ نہ مجالس قانون ساز میں اللہ کی کتاب کو کوئی درخور حاصل ہو اور نہ ثقافتی اور تہذیبی دائروں میں دین کا کوئی دخل ہو۔ یہود اور مشرکین کے ادعائے پاکی و برتری ـــــ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ ـــــ کو قرآن نے ان کے اقسام شرک میں گنایا تھا۔ اس کی تفسیر حال کے مسلمانوں نے کتنی خوبی کے ساتھ سمجھادی ہے۔ وہ خدا کے محبوبوں کی اولاد اور افضل امت تھے، اس لیے سمجھنے لگ گئے ہیں کہ وہ خیر الامم ہیں، اس لیے ان کا ہر کام بہتر اور پاک ہے، ان کی اکثریت جو قانون وضع کردے وہ خدا کا قانون ہے، وہ جو پالش مسلمانوں کے چہروں کے لیے تیار کردیں، وہ صبغۃ اللہ ہے اور اس راہ میں جو ان کی قیادت کرے وہ رہبر اعظم ہے۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے　　جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

گویا مسلمان نامی گروہ میں ہونا ہی راہ یاب ہو جانا ہے، اگرچہ زندگی خدا سے بغاوت اور نافرمانیوں ہی میں گزرے، یہ حلقہ بجائے خود خدا سے نافرمانی کے لیے امن ہے، جو اس سے باہر ہیں وہ دوزخی اور جہنمی ہیں، لیکن جو اس کے اندر ہیں وہ عبد کے بجائے طاغوت بن کر بھی خدا کی رحمت کے حق دار ہیں، حضرت صادق مصدوق علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ تم اپنے اگلوں ـــــ یہود ـــــ کے ہر نقش قدم کی پیروی کرو گے۔ غور کیجیے مسلمانوں کی اس ذہنیت اور ''کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا'' (البقرہ ۲:۱۳۵) (یہود یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے) اور وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرہ ۲:۸۰) (ان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر صرف گنتی کے چند دن) میں کیسا حیرت انگیز تشابہ ہے۔

قرآن نے یہود اور منافقین کی طاغوت پرستی اور حمایت شرک کو شرک قرار دیا ہے، یہود کی طاغوت پرستی یہ تھی کہ وہ ایسے لیڈروں کی پیروی کرتے تھے، جو اللہ کی ہدایت کی جگہ لوگوں سے اپنی ہوائے نفس کی پیروی کراتے تھے، مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے ان میں کتنے ہیں جو آج ایسے ہی لیڈروں کی پیروی کر رہے ہیں، جو ان سے اپنے ہوائے نفس کی پیروی کرا رہے ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے وہ داعی ہیں۔ نہ ان سے واقف ہیں، نہ ان پر عامل ہیں، کتنے سادہ لوح ایسے ہیں جو برملا کہتے ہیں کہ ان کا راستہ اللہ اور رسول کا راستہ نہ سہی، لیکن ان کے اندر مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ تو ہے، طاغوت بننے کی اس سے زیادہ بری مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج مسلمانوں کو اللہ، اس کے دین اور اس کے رسول کی خیر خواہی سے زیادہ خود اپنی خیر خواہی مطلوب ہے، اگر ان کی اپنی بات بنتی ہے، تو کچھ پروا نہیں گو خدا کی بات بگڑ جائے۔ اگر ایک شخص ان کو ایک ایسی راہ پر لیے جا رہا ہے جس میں ان کو اپنے غرور کا سر اونچا نظر آتا ہے تو دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے تو کچھ غم نہیں، اللہ اکبر! کیسے شدید فتنہ کا زمانہ ہے کہ مسلمان خدا کی عبدیت سے نکل کر بھی اپنے مسلمان ہونے کا مدعی ہے اور ان لوگوں کو وہ اپنا بہترین خیر خواہ سمجھتا ہے جو کھلم کھلا اس کو اللہ کے دین کے سوا کسی اور راستہ پر لے جا رہے ہیں۔

منافقین کی طاغوت پرستی یہ تھی کہ وہ اپنے بعض معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، اللہ اور اس کے رسول کی عدالت میں نہیں لاتے تھے، یہاں یہ حال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کا غلبہ ہے، عدالتیں طاغوتی ہیں اور مسلمان ہر طرح کے معاملات میں ان ہی سے رجوع کرتے ہیں، درس گاہیں طاغوتی ہیں اور مسلمانوں کا بڑا طبقہ اپنے بچوں کو ان ہی کے حوالہ کرتا ہے، نظام حکومت طاغوتی ہے اور مسلمان نہ صرف اس کے کل پرزے بنے ہوئے ہیں، بلکہ اس کے اندر ترقی درجات کے لیے مقابلہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تہذیب طاغوتی ہے اور مسلمان اس غازۂ جمال کو لیپنے میں بھی سب سے زیادہ مسرف ہیں، نظام معاش و معیشت طاغوتی ہے اور مسلمان اس کو اپنانے میں بھی پیش پیش ہے، ادب اور آرٹ طاغوتی ہے اور مسلمان اس میں بھی اپنے حصہ کے لیے بے قرار ہے اور شاید گنتی کے نفوس ہوں گے جو ان چیزوں کے اندر کوئی قباحت محسوس کرتے ہیں۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ شرک کی حمایت و تائید بھی شرک ہے، لیکن یہاں کتنے مسلمان ہیں جو اپنے ذہن و دماغ اور اعضاء و جوارح کی ساری قوتیں ایک طاغوتی نظام و تمدن کی کامیابی و ترقی میں صرف کر رہے ہیں، کتنے ہیں جو اپنے مال سے اس کی سربلندی اور استحکام میں ساعی ہیں، کتنے ہیں جو اس کلمۂ کفر کے اعلاء کی راہ میں اپنی جانیں تک قربان کر رہے ہیں۔

اسلامی احکام و تعلیمات کے خلاف منافقین کی سرگوشیوں اور اہل ایمان کے طریقہ کے خلاف ان کی خود رائیوں کو بھی قرآن نے شرک قرار دیا ہے، لیکن آج کتنے مسلمان ہیں جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف صرف نجویٰ پر قانع نہیں ہیں، بلکہ علانیہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، شریعت کے احکام کو فرسودہ، ناقابل عمل اور خلاف عقل و تہذیب قرار دیتے ہیں، اسلامی تعزیرات اور اسلامی نظام معاش و معیشت کو صرف ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے حالات کے لیے سازگار بتاتے ہیں۔ قرآن کی عقلیت کو بہتیرے زمانہ کے معیار سے

فروتر سمجھتے ہیں، اور اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ وہ ظاہر سے متعلق ہو یا باطن سے، اس جادہ سے منحرف ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے اہل ایمان کے لیے متعین کیا، ان کا فکر غیر اسلامی ہے، ان کی معاشرت غیر اسلامی ہے جو چیز اللہ و رسول کے ہاں مطلوب ہے ان کے ہاں مبغوض و مہجور ہے، جو اللہ و رسول کے نزدیک مبغوض و مردود ہے وہ ان کے ہاں مطلوب و مقبول ہے، انہوں نے یا تو اپنے نفس کو الٰہ بنا رکھا ہے یا ان لوگوں کو الٰہ بنا رکھا ہے جن کی تعلیم و تہذیب سے وہ مرعوب ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کی نسبت صرف اس قدر ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے باوجود اپنے تئیں مسلمان بھی کہتے ہیں۔

منافقین کی مفاد پرستی کو بھی شرک قرار دیا گیا ہے، آج کتنے مسلمان ہیں جو اللہ کی بندگی کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن وہ بالکل وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (الحج ۲۲:۱۱) (جو خدا کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں) کی تصویر ہیں، جس حد تک اسلام کے اقرار اور اس کی پیروی میں کوئی خرخشہ نہیں ہے اس حد تک وہ مسلمان ہیں، لیکن جہاں سے اسلام کے وہ مطالبات شروع ہوتے ہیں، جن سے ان کے کسی دنیوی مفاد کو نقصان پہنچتا نظر آتا ہے یا زندگی کو آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہیں سے وہ کٹ کے الگ ہو جاتے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ اور رسول کے حوالے نہیں کیا ہے، وہ رسول کو صرف اعتقاد کے حد تک رسول مان لینا کافی سمجھتے ہیں۔ اس کی لائی ہوئی تعلیم اور اس کی بخشی ہوئی ہدایت کا زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ہونا ان کے نزدیک توحید اور ایمان بالرسالت کا جزو نہیں ہے، حالانکہ ہر رسول اُعْبُدُ اللّٰهَ (اللہ کی بندگی کرو) کے ساتھ وَاَطِيْعُوْنِ (اور میری اطاعت کرو) کا بھی حکم دیتا ہے اور یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ جو میرے طریقے کے خلاف ہیں ان سے بغاوت کرو: وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ (شعراء ۲۶:۱۵۱)

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے کفر و اسلام کی اصلی نزاع شروع ہوتی ہے، ورنہ مجرد اس اعتقاد میں کہ اللہ ایک ہے، رسول اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ ہم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے نبیوں اور اس کی کتابوں اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں، ایسی کیا بات ہے جس پر گردنیں

کٹیں، تلواریں چمکیں اور ہجرت، جہاد اور قتال کے مرحلے پیش آئیں؟ عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ایسے لوگ موجود تھے جو بت پرستی کے کھلم کھلا منکر تھے اور ان میں بعض مشہور خطیب بھی تھے۔ جو علانیہ اپنے خطبوں میں توحید کا ذکر کرتے تھے، لیکن قریش کو ان سے کوئی خاص پرخاش نہ تھی۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مجرد اس بات پر لڑائی کرتے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے ہیں اور بتوں کے مخالف ہیں، ان کی ساری لڑائی تو اسی بات پر تھی کہ یہ خدا کی اطاعت کو اس کی بندگی کا ضروری جزو قرار دیتے ہیں، اور اس اطاعت کا راستہ اپنی اطاعت بتاتے ہیں اور ہم سے بغاوت اس کی شرط لازم قرار دیتے ہیں۔

دین کا یہی حصہ ہے جو پرائیویٹ نہیں ہوسکتا ہے جو لازماً اپنے پیروؤں سے اپنی اقامت کے لیے سرفروشی اور جانبازی کا مطالبہ کرتا ہے چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اہل عرب اپنے اندر دین حنیفی کے پیروؤں کو برداشت کرسکے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہ کو گوارا نہ کرسکے، پس جو مسلمان اپنے ایمان باللہ و ایمان بالرسول کے ساتھ دوسرے دینوں کی اطاعت جمع کرلینے میں شرک کا کوئی شائبہ نہیں پاتے، جن کا دین کوبے میں ایک مسجد اور لندن میں ایک قبرستان سے زیادہ کا طلب گار نہیں ہے، جن کے لا الہٰ کی زد صرف مردہ خداؤں ہی پر پڑتی ہے، زندہ خداؤں کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا ہے، انہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ ان کے لیے نہ صرف ہندوستان، بلکہ تمام دنیا دارالامن ہے، ایسی بے دھار کی تلوار سے نہ عرب جاہلیت کو کچھ اندیشہ ہوسکتا تھا، نہ جاہلیت جدیدہ کو اس سے کوئی اندیشہ ہوسکتا ہے، اور اگر جاہل عربوں کو اس سے کچھ چڑ تھی بھی تو موجودہ زمانہ کے متمدن انسان کو اس بے دہانہ کی توپ اور اس ڈمی بندوق سے کوئی خطرہ نہیں ہے، وہ اس بات پر راضی ہے کہ پوجا جس کی چاہے ہوتی رہے، البتہ اطاعت صرف اسی کی جائے۔

باب ۸

وقت کا اصلی فرض
اور
بعض شبہات کا ازالہ

جو چیزیں شرک ہیں یا جن چیزوں میں شرک کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی ہے ان کے ساتھ ایک مسلمان کا فطری تعلق وصل کا نہیں، فصل کا ہے، دوستی کا نہیں، دشمنی کا ہے، محبت کا نہیں، عداوت کا ہے، حمایت ونصرت کا نہیں، نفرت اور بغاوت کا ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اگر اس کے پاس طاقت ہے تو طاقت سے اس کو مٹا دے، اگر طاقت نہیں ہے تو زبان سے اس کے خلاف آواز بلند کرے، اگر اس کی قدرت بھی اس کو حاصل نہیں ہے تو دل میں اس سے بغض ونفرت رکھے، اس سے نیچے عزم وایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

پچھلے ابواب میں مسلمانوں کی جو حالت بیان ہوئی ہے اس سے واضح ہے کہ ان کی اکثریت کا حال اس کے بالکل برعکس ہے، مسلمان نہ صرف عزم اور ایمان کے آخری درجہ سے گرتے جا رہے ہیں بلکہ ان کے اوپر آہستہ آہستہ شرکیہ اعمال وعقائد کی تہیں جمتی جا رہی ہیں اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک مدت سے کسی صحیح دینی نظام کے موجود نہ ہونے اور طاغوت کے غلبہ کی وجہ سے توحید اور اس کے مقتضیات کا صحیح شعور ان میں غائب ہوتا جا رہا ہے، پس وقت کا اصلی فرض یہ ہے کہ ایک ایسی صالح ومصلح جماعت کھڑی ہو جو مسلمانوں میں توحید کا صحیح شعور بیدار کرے، جو لوگوں کو عبادت اور عبدیت کا اصلی مفہوم بتائے جو خدا کی حاکمیت اور رسول کے مطاع ہونے کا لوگوں کو مطلب سمجھائے، جو دنیا پر

واضح کردے کہ اسلام اور ایمان کے مقتضیات ولوازم کیا ہیں جو خدا کی زمین پر اس فرض کو انجام دے جو بحکم خداوندی كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۲:۱۴۳) (اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے)۔ رسول خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر عائد ہوتا ہے۔ جو خلق خدا کو خدا کی وہ امانت ادا کردے جس کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے یہود ملعون ہوئے: لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ (المائدہ ۵:۶۳) (ان کے علماء اور فقہا ان کو گناہ کی بات کہنے اور ان کو حرام کھانے سے روکتے کیوں نہیں؟) اور جو اللہ تعالیٰ کے اس منشا کو پورا کرے جس کی تکمیل کے لیے اس نے بار بار اپنے انبیاء مبعوث فرمائے اور جس کے لیے کتنی قوموں کو اس نے معزول اور کتنی امتوں کو نامور فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (اٰل عمران ۳:۱۰۴)

"اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔"

یہ جماعت تنہا زبان وقلم سے نہیں، بلکہ اپنے عمل سے خدا کی توحید کی شہادت دے، یہ دنیا کو اللہ کے رنگ میں رنگنے کے لیے اٹھے اور خود اس رنگ میں رنگی ہوئی ہو، قوم ووطن کی ساری عصبیتیں اور نسل وخاندان کی ساری بندشیں اس نے توڑ ڈالی ہوں، کسی خاص قوم کی سیاسی برتری، عددی اکثریت اور معاشی فوقیت کی کوئی ادنیٰ خواہش بھی اس کے دل کے کسی گوشہ میں چھپی ہوئی نہ ہو، اس کی ساری جدوجہد کا مقصود صرف اللہ کا کلمہ اور اس کے رسولوں کی دعوت کو بلند کرنا ہو، اس کی دشمنی دنیا کے کسی ایک ہی باطل سے نہ ہو، بلکہ دنیا کے ہر باطل اور زمین کے ہر فساد سے ہو، اس کی ضرب بیک وقت ہر جاہلی اور طاغوتی نظام پر پڑے، یہاں تک کہ وہ طاغوت بھی اس سے کسی چشم پوشی اور رعایت کا امیدوار نہ ہو جو اس

قوم کے اندر ہو، جس کے اندر سے وہ خود اٹھی ہو، وہ باطل کو ایک ایک کر کے انتخاب کرے اور حق کے لیے اپنی دوستی کا اور باطل کے لیے اپنی دشمنی کا اعلان کر دے۔ اس راہ میں اپنی ساری آرزوؤں، ساری تمناؤں، ساری دوستیوں اور تمام رشتوں اور ناتوں کو قطع کر لے اور جو کچھ اس کے صلہ میں اللہ کے پاس ہے اس پر قانع ہو جائے، اس کی دعوت ساری خدائی کے لیے یکساں اور عام ہو، اس کی جھولی کی روٹی اور اس کی چھاگل کے پانی میں ہر بھوکے اور پیاسے کے لیے آسودگی اور سیرابی ہو۔ اس کا چراغ پہاڑی کے چراغ کی طرح چمکے اور ہر گم گشتہ راہ کی رہنمائی کے لیے اشارہ کرے۔ اس کی ہدایت کی ضیا پاشیاں خدا کے سورج کی طرح عام و ہمہ گیر ہوں، اس کا ابر کرم آسمان کی بارش کی طرح ہر دشت و جبل کو سیراب کرے، اس کی گفتگو ہر بولی میں، اس کی مخاطب تمام نسل انسانی ہو، وہ چیخ چیخ کے پکارے اور لپٹ لپٹ کر سمجھائے اور نوع انسانی کی روحانی بیماریاں اس کو اس درجہ بے قرار کر دیں۔ کہ وہ خلوت کے سجدوں میں اس کی نجات کے لیے پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ اس کی راتیں بستر کی لذتوں سے محروم ہو جائیں، اور اس کے دن فراغت کی گھڑیوں سے بے نصیب ہو جائیں، وہ مخلوق خدا کی گردن میں اتنے بے شمار ارباب و آلہہ کی غلامی کا بوجھل طوق دیکھ کر دکھ اور درد سے بھر جائے اور ہر سننے والے کان اور ہر دیکھنے والی آنکھ تک اللہ کی وہ دعوت قولاً و عملاً پہنچا دے جو ان تمام مصائب کا واحد علاج ہے۔

ایک ایسی بے ہمہ و باہمہ جماعت اپنے مقصد میں ناکامیاب نہیں ہو سکتی، طاغوت کے ہمہ گیر غلبہ کے باوجود انسان کی فطرت مردہ نہیں ہو گئی ہے، خدا کے کتنے بندے ایسے ہیں جن کے دلوں میں توحید اور اس کے لوازم کا شعور آج بھی زندہ ہے، لیکن ان کے اندر وہ عزم و ہمت نہیں ہے جو انہیں وقت کے حالات سے پیکار کے لیے بے چین کر دے، وہ امر حق کو قبول کرنے کے لیے کسی دلیل و برہان کے منتظر نہیں ہیں، ان کو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی خدا کا مخلص بندہ ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ'' کی آواز بلند کر دے اور اپنے عزم راسخ اور حسن نیت سے ان کو یقین دلا دے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہی چاہتا بھی ہے، جوں

ہی یہ حقیقت ان کے سامنے روشن ہو جائے گی وہ اپنی غفلت کے بستروں کو تہ کر کے اور علائق کی ساری زنجیروں کو توڑ کر اس کے ساتھ ہو لیں گے۔

کتنے ایسے ہیں جن میں شرک سے پوری پوری بیزاری موجود ہے، لیکن توحید کے تمام مقتضیات ولوازم کا ان کو پورا علم نہیں ہے، انہوں نے انسان کی عبدیت، خدا کی حاکمیت، رسول کی رسالت اور اسلام وایمان کا حقیقی مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھا ہے، مذہب کا مطالعہ یا تو انہوں نے کیا نہیں ہے، یا کیا ہے تو مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ نہیں کیا ہے اس وجہ سے وہ اپنی موجودہ زندگی کو خدا کے راستہ سے الگ نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو کم از کم اس علیحدگی کی اصلی نوعیت ان کے سامنے نہیں ہے، وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگرچہ انہوں نے خدا کے راستہ سے کچھ الگ ہو کر ایک راہ ضرور نکال لی ہے، لیکن یہ انفصال ایسا نہیں کہ پھر اتصال ناممکن ہو جائے، وہ جوں ہی محسوس کریں گے کہ یہ دو مستقل خط دو مختلف سمتوں میں بڑھ رہے ہیں اور جس قدر آگے بڑھتے جائیں گے، ایک دوسرے سے ان کی دوری بڑھتی ہی جائیگی، یہاں تک کہ آخرت میں پہنچ کر وہ ''اَضَلُّ سَبِیْلاً'' کے حکم میں ہو جائیں، وہ فوراً اپنے پوزیشن پر غور کریں گے اور ان کی بڑی تعداد ان شاء اللہ حق کا ساتھ دے گی۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حق کو حق سمجھنے میں غبی نہیں ہیں، لیکن اپنی مشکلات کا اندازہ کرنے میں غبی واقع ہوئے ہیں، وہ صحیح دعوت کے ذریعہ سے خدا اور اس کی اعلیٰ صفتوں کا علم جتنا پاتے جائیں گے اپنے نفس کی زنجیروں سے اسی قدر چھوٹتے جائیں گے، یہاں تک کہ ان میں للہ کے کتنے بندے ایسے نکل آئیں گے جو روح کو جسم پر، ایمان کو پیٹ وتن پر، اور خدا اور اس کی بندگی کو دنیا اور اس کی جھوٹی عزتوں اور نمائشوں پر ترجیح دیں گے اور صرف خدا ہی کے راستہ میں ان کو سلامتی نظر آئے گی اور جو زیادہ پست ہمت ہوں گے ان میں اہل حق کی ایک جماعت کے عملی مظاہرے سے ہمت وقوت پیدا ہوگی۔ وہ جب دیکھیں گے کہ اس آسمان کے نیچے خدا کے ایسے بندے بھی ہیں جنہوں نے اپنے خالق کی بندگی کی راہ میں جھوٹی عزتوں پر لات ماری ہے، دنیا کو ٹھکرایا ہے، طاغوت سے سرکشی کی ہے، اپنے دنیاوی

مفاد اور اپنے اہل وعیال کے لیے ہر خطرہ کو دعوت دی ہے تو ان کے ضمیر میں بھی قوت پیدا ہوگی، وہ بھی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنے پروں کی قوت پرواز کی آزمائش کریں گے۔

چونکہ اس جماعت پر کسی خاص قومیت کا لیبل چپکا ہوا نہ ہوگا، بلکہ اس کا تمام تر رشتہ صرف اللہ کے دین اور اس کے اصولوں سے ہی ہوگا اس لیے خدا کا ہر بندہ اس کی دعوت پر مجرّد اس دعوت کی صفات کے لحاظ سے غور کرے گا، اس کو کسی قوم کی عددی اکثریت یا سیاسی برتری کی جدوجہد سمجھ کر اس سے بدگمان نہ ہوگا اور یہ حقیقت جس رفتار کے ساتھ نمایاں ہوتی جائے گی اسی رفتار سے اس دعوت کی مقبولیت بڑھتی جائے گی، ایک عیسائی، ایک انگریز، ایک جرمن، ایک اطالوی، ایک ہندو، ایک جین، ایک بدھ، سب اس پر مجرد اس پہلو سے غور کریں گے کہ اس دعوت کی عقلی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کا اخلاقی معیار کیا ہے؟ معاشی اور سیاسی نقطۂ نظر سے اس کا درجہ کیا ہے؟ دنیا کے تمام آزمائے ہوئے طریقوں اور دینوں میں اس کو امتیاز حاصل ہے؟ اور کس حد تک یہ دنیا کی مشکلات کا علاج ہے؟ یہ چیز دفعتہً اسلام کو ایک متحرک چیز بنا دے گی اور جو چیز ایک بند تالاب کے پانی کی طرح ساکن و جامد ہے وہ ایک سیلاب کے جوش وطوفان کی طرح ہر پست و بلند پر چھا جائے گی۔

اس جماعت کی دعوت اس مفروضہ سے نہیں شروع ہوگی کہ ہندوستان میں دس کروڑ بنے بنائے مسلمان موجود ہیں، ان کو بارہ یا سولہ کروڑ کی تعداد تک پہنچانا چاہیے، بلکہ وہ ان مسلمانوں کے درمیان ان کے عقائد و اعمال کی بنا پر فرق کرے گی، لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس کی دعوت ''یاایّھاالمشرکون وحّدوا اللّٰہ'' (اے مشرکو، اللہ کو ایک مانو) ''یاایّھاالکٰفرون امنو باللّٰہ'' (اے کافرو، اللہ پر ایمان لاؤ) سے شروع ہوگی، جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ اس طریق دعوت سے بالکل ناواقف ہیں جو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے ماخوذ ہے اور جس کی سب سے زیادہ مکمل تصویر خود قرآن پاک میں موجود ہے۔

قرآنی دعوت کے تدریجی مراحل پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو باوجودیکہ آپ کی پوری قوم کافر و مشرک تھی، لیکن آپ نے دعوت کا آغاز ''اے کافرو'' اور ''اے مشرکو'' کے الفاظ سے نہیں کیا تو پھر ان لوگوں کو جو آپ کے امتی ہیں ان لوگوں کے اندر جو پشتہا پشت سے مسلمان ہیں اور نہیں معلوم ان میں کتنی عظیم تعداد بندگان حق کی ہے، یہ حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ ان کو کافر یا مشرک فرض کر کے اپنی دعوت کا آغاز کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت حق کا آغاز ''اے میری قوم'' اے لوگو'' اے انسانو'' سے کیا اور پہلے لوگوں کے اندر ان کے اصولی مسلمات کے مقتضیات ولوازم کا احساس بیدار کیا اور کفر و شرک کے قبیل کی جو باتیں ان کے اندر پیدا ہوگئی تھیں ان کا کفر و شرک ہونا واضح کیا۔ یہ کام جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا جاری رہا، یہاں تک کہ قوم پر اللہ کی حجت تمام ہوگئی۔ جن لوگوں کے اندر صلاحیت قومی تھی وہ رفتہ رفتہ حق کے ساتھ ہو گئے اور جن کے قلوب مردہ ہو گئے تھے یا جن کے حجابات سخت تھے انہوں نے نہ صرف یہ کہ خود اپنی زبان سے اپنے کفر کا اعلان کر دیا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر لیا، اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم ہوا اور یہ پہلا موقع ہے کہ آپ کی زبان سے اپنی قوم کے لیے ''اے کافرو'' کا لفظ نکلا جو ہجرت و براءت کی عظیم الشان سورہ ''قل یاَیُّھَاالْکٰفِرُوْنَ'' میں ہے اس سے پہلے قرآن میں ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنی قوم کے لیے یہ خطاب نہیں ملتا، اسی طرح مشرکین کا لفظ بھی اہل مکہ کے لیے بالکل ہجرت کے وقت یا اس کے بعد استعمال ہوا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اہل کتاب کو جو دعوت دی گئی وہ بھی ''اے کافرو'' اور ''اے مشرکو'' سے نہیں شروع ہوئی بلکہ ''اے اہل کتاب'' اور ''اے لوگو'' سے شروع ہوئی اور جب تک ان پر ان کے مسلمات کے تمام مقتضیات پوری طرح واضح نہیں کر دیے گئے اور نبی اور ایک صالح جماعت کی ایک طویل جدوجہد نے ان کے لیے حق کی توضیح اور اتمام حجت کا فرض ادا نہیں کر دیا اس وقت تک نہ ان کے کفر و شرک کا اعلان ہوا اور نہ ان سے جنگ و قتال کی نوبت آئی۔

بالکل یہی معاملہ منافقین کے ساتھ ہوا، یہ لوگ اسلام کے تمام اصولوں کے ظاہری طور پر ماننے والے تھے، اس لیے قرآن نے ان کو ہمیشہ ''اے ایمان والو'' کہہ کر خطاب کیا اور ان کے سامنے ایمان، اسلام، توحید اور ایمان بالرسالت کے مقتضیات کی تشریح فرمائی تاکہ جو لوگ غفلت اور جہالت کی وجہ سے غلطیاں کر رہے ہیں وہ متنبہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ان کو دھمکی دی کہ جو لوگ اپنی شرارتوں اور بدعہدیوں سے باز نہ آئیں گے ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ غزوۂ بدر کے زمانہ سے لے کر غزوۂ تبوک تک ضعفائے قلوب اور منافقین کے بارہ میں یہی روش رہی، اس بیچ میں اگر کبھی پر جوش مسلمانوں سے اس کا اندیشہ ہوا کہ وہ ان کے بارہ میں سختی کی روش اختیار کر لیں گے تو انہیں اس سے روکا گیا۔ قرآن اور احادیث دونوں میں اس کی شہادتیں موجود ہیں، اس طرح جو لوگ متنبہ ہو گئے اور انہوں نے اپنے معاملہ کی اصلاح کر لی، وہ مسلمان اور خادم اسلام سمجھے گئے۔ لیکن جو لوگ ان تنبیہات کے بعد بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے ان کا راز طشت از بام کر دیا اور ان کے معاملہ کا فیصلہ کر دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ جو اختیار فرمایا تو یہ محض نفسیات تبلیغ و دعوت کی کوئی جھوٹی نمائش نہیں تھی، بلکہ یہ بات ایک نہایت اہم اصل پر مبنی ہے، جس سے لوگ بالعموم اس عہد میں ناواقف ہیں، ایک شے اگر کفر یا شرک یا نفاق ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتکب کافر یا مشرک یا منافق ہو جائے، ایک حرام شے کا کھانے والا لازماً حرام خور یا فاسق ہی نہیں ہو جاتا، ممکن ہے اس کو اس کی حرمت کا علم نہ ہو، ممکن ہے اس کی حالت مجبوری اور اضطرار کی ہو، ممکن ہے وہ تاویل کی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو، ممکن ہے کوئی اور بات ہو، بالخصوص انبیاء کے فترہ کے زمانے میں ایک طویل مدت تک دعوت حق کا کاروبار معطل رہنے کی وجہ سے ایک ایسی اندھیاری چھا جاتی ہے کہ آنکھ والوں کو بھی راہ سوجھائی نہیں دیتی چہ جائے کہ عوام کالانعام، ایسے زمانوں کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو نبی آتا ہے وہ کفر، شرک یا نفاق کے الگ ٹھپے لے کر نہیں آتا کہ جس اللہ کے بندے پر جو ٹھپہ

چسپاں ہو جائے ، اس پر وہ ٹھپہ چسپاں کرتا چلا جائے کہ تو کافر ہے ، تو منافق ہے اور تو مشرک ہو گیا ہے بلکہ وہ دین حق کے آثار اجاگر کرتا ہے ، اٹے ہوئے نشانات راہ کو نمایاں کرتا ہے ، بند راہوں کو کھولتا ہے اور ایک مستقل جدوجہد ، ایک مسلسل جہاد اور ایک پاک اور بے داغ زندگی بے لوث کارگزاریوں سے حق کو نور صبح کی طرح نمایاں کر دیتا ہے ، اس جدوجہد سے قوم کے اندر صالح الفطرت انسانوں کا عطر کھنچ کر علیحدہ ہو جاتا ہے اور ان کا امتیازی وجود حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے کا ایک اور عملی ثبوت ہوتا ہے ، اس وقت جن کے اندر شعور حق کی کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے وہ آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں کہ خدا کا راستہ یہ ہے اور اس پر چلنا ممکن بھی ہے تب ان لوگوں کے کفر کا فیصلہ کر دینے کے لیے یا تو اللہ کا عذاب نمودار ہوتا ہے یا اہل حق کی تلوار چمکتی ہے ، حضرات انبیائے کرام کی زندگی سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

آج جو لوگ تجدید دین واحیائے سنت کے مبارک عزم کے ساتھ اٹھیں گے ، وہ اسی طریقہ نبوت سے رہنمائی حاصل کریں گے ، ظاہر ہے کہ اس امت کو اب کسی نبی کی بعثت کا انتظار نہیں ہے اس کے اندر اقامت دین وتجدید دین کا شرعی نظام طریقۂ نبوی پر کام کرنے والی خلافت کا نظام ہے وہی نظام تھا جو مسلمانوں کو وسط راہ پر قائم رکھتا اور پھر وہی خلق خدا پر اللہ کی حجت تمام کرتا ہے لیکن یہ نظام ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے ، اس کی جگہ ایک طاغوتی نظام کا قبضہ وتسلط ہے ، اس نظام نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو نجس کر دیا ہے۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس طاغوت کی ماتحتی سے آزاد ہو ، ہمارے اندر سے جو لوگ طوعاً اس کی اطاعت نہیں کر رہے ہیں انہیں کرہاً اس کی اطاعت کرنی پڑ رہی ہے۔ متقی سے متقی انسان کا دامن بھی اس کی نجاست کے چھینٹوں سے پاک نہیں ہے ، دینی تعلیم وتربیت کا سارا نظام معطّل ہے ، جو موجود ہے وہ بھی نظام غالب کی سطوت سے اسی کا خادم وچاکر ہے ، قلم وزبان کلمۂ حق کے سوا ہر خرافات کے لیے آزاد ہے ، دین ومذہب کے نام سے آج جو لکھا یا سنایا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ موجودہ سوسائٹی اور موجودہ نظام جاہلی کے لیے مذہب کی

طرف سے ایک لائسنس ہے۔

ایسے پُر آشوب و پُرفتن عہد میں اگر مسلمان دین اور اس کے لوازم، توحید اور اس کے مقتضیات سے نا آشنا ہو جائیں تو کچھ بعید نہیں ہے، ایک چمن اگر مالیوں کی نگہداشت سے محروم ہو گیا ہو یا جو اس کے مالی ہوں ایک مدت سے اس کی صفائی، اس کے درختوں کی کانٹ چھانٹ، اس کی خودرو گھاسوں کے استیصال، اس کے ننھے پودوں کی دیکھ بھال کے بجائے جنگلی گھاسوں اور درختوں ہی کو چمن کے اصلی پودے سمجھ کر انہی کو پانی دینے اور انہی کی تربیت کرنے لگ گئے ہوں تو اس چمن کا جنگل بن جانا ایک قدرتی بات ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی صحیح مثال یہی ہے۔ وہ ایک قدرتی فرض ہے جو ایک کسان اپنے کھیت میں، ایک مالی اپنے چمن میں، ایک باغبان اپنے باغ میں، ایک راعی اپنے گلہ میں، ایک ہادی اپنی قوم میں، ایک امت کے ارباب حل وعقد اس امت کے اندر انجام دیتے ہیں، اور نظام خلافت اسی فرض کی ادائگی کے لیے ایک قدرتی اور فطری نظام ہے، اس کے بغیر نہ مسلمانوں کا صحیح نہج پر قائم رہنما ممکن ہے اور نہ اس کے بغیر دنیا پر دین کی حجت تمام ہو سکتی ہے۔ پس آج نہ مسلمانوں کا صراط مستقیم سے انحراف قابل ملامت ہے، نہ خلق خدا کی ضلالت قابل سرزنش ہے۔ مسلمان اس سرزمین کے لیے نمک تھے، جب ان کی نمکینی خود جاتی رہی تو اب کوئی چیز نمکین کس چیز سے بنائی جائے گی۔

پس آج جو جماعت مسلمانوں میں توحید اور اس کے مقتضیات کی دعوت کے لیے اٹھے وہ انتہائی حد تک بے رحم ہو گی اگر وہ یہ فرض کر کے اٹھے کہ یہ سارے کے سارے مسلمان کافر و بے دین ہو چکے ہیں اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے اس طرز عمل سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچائے گی کہ نہ اسے حالات کا صحیح اندازہ ہے اور نہ انبیائے کرام کے طریق دعوت سے اسے کوئی مس ہے۔ کسی کے کفر و فسق کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ کتاب الٰہی کی اچھی طرح وضاحت کرے، ایک صالح جماعت کے قیام کے لیے اپنی پوری جدوجہد صرف کر دے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس ظلمت کو دور کر دے جو ہر طرف

چھائی ہوئی ہے اور حق و باطل کا امتیاز ہر طالب حق کے لیے آسان ہو جائے۔

تکفیر کا اصلی مفہوم تو یہ ہے کہ کسی شخص کو مرتد قرار دے کر اس کو وہ سزا دی جائے جو اسلام میں ارتداد کے لیے مقرر ہے۔ یہ سزا ایک صالح اور با اختیار جماعت اپنے اندر کے ان افراد کو دیتی ہے جو اس دعوت اور اس کے نظام کے بنیادی اصولوں سے علانیہ اور دیدہ و دانستہ بغاوت کرتے ہیں اس سزا کے نفاذ کے لیے شرط ہے کہ ایک جماعت موجود ہو جو صالح ہو، ایک غیر صالح جماعت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو غیر صالح قرار دے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ جماعت با اختیار ہو، کوئی بے اختیار جماعت تعزیرات و حدود کے اجرا کا حق نہیں رکھتی، تیسری شرط یہ ہے کہ ایک صالح جماعت کے قیام سے ماحول ایسا بن چکا ہو کہ وہ منکرات و معاصی کے لیے سازگار نہ رہ گیا ہو اور خدا کے بندوں پر دین کی حجت تمام کرنے اور حق کی توضیح کے ضروری وسائل برسر کار ہوں، بغیر اس کے نہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جا سکتی ہے، نہ زانی کو سنگسار کیا جا سکتا ہے، نہ شراب پینے والے کو کوڑے مارے جا سکتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ایک صالح و با اختیار جماعت برسر اقتدار بھی ہو اور وقت کی مذہبی فضا بھی ایسی ہو کہ جرائم کے لیے اخلاقی رکاوٹیں موجود ہوں، لیکن کسی عارضی سبب سے جرم کے محرکات پیدا ہو جائیں، تو اس جرم کی شرعی سزا حکومت جاری نہیں کریگی۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑ گیا اور آپ کی انتہائی کوشش کے باوجود ملک کا معاشی توازن قائم نہیں رہ سکا تو آپ نے حالات کی درستگی تک کے لیے چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ملتوی کر دی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد میں ایک عورت زنا کے جرم میں پکڑ کر لائی گئی، علمائے یہود نے اس کو سنگسار کیے جانے کا مطالبہ کیا، حضرت نے فرمایا، ہاں اس کو سنگسار کر دو، مگر اس کو وہ شخص پتھر مارے جو خود پاک ہو، حضرت مسیح علیہ السلام کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس عہد میں سب زانی ہی زانی ہیں، کوئی عفیف اور پاک دامن نہیں رہ گیا ہے، بلکہ ان کا اشارہ وقت کی فضا کی طرف تھا کہ اس وقت نہ کوئی صالح جماعت موجود ہے، نہ صالح نظام

قائم ہے، نہ شرعی ماحول ہے۔ اگر یہ عورت اپنے شوہر سے خیانت کی گنہگار ہے تو تم میں سے کون ہے جو اس سے بڑے گناہ، یعنی اپنے خدا سے خیانت اور بے وفائی کا مجرم نہیں ہے۔ تم نے خدا کے عہد کو توڑا ہے اور اس جرم کی سزا میں خدا نے مشرک رومیوں کو تم پر مسلط کر دیا ہے تو تمہیں یہ حق کب پہنچتا ہے کہ ایک عورت کو اس کی بے وفائی پر سزا دو۔

پس تکفیر جو ایک سخت ترین سزا ہے، جس کے بعد ایک شخص جماعت سے ہمیشہ کے لیے کٹ جاتا ہے، جس کے بعد وہ واجب القتل مرتد ہو جاتا ہے، اس زمانہ میں کسی کو دینا اصولاً غلط ہے۔ اس وقت نہ تو کوئی صالح و با اختیار جماعت ہی موجود ہے اور نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہ شرعی نظام ہی قائم و زندہ ہے جو لوگوں کے اندر کفر و شرک کا احساس و امتیاز زندہ رکھے، زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کی سیاہی چھائی ہوئی ہے اور حق و باطل میں نہ صرف امتیاز معدوم ہے، بلکہ باطل کو حق بنا کر چمکانے کی سعی کے لحاظ سے شاید یہ تاریخ کا سب سے کامیاب دور ہے ایسے زمانہ میں جو لوگ تکفیر و تفسیق کے کھیل کھیل رہے ہیں وہ وقت کی حالت، تکفیر کی اہمیت اور اس کے شرائط و قواعد سے بالکل بے خبر ہیں اور موجودہ دور جہل و فساد کی قدرتی پیداوار ہیں۔ اپنے جن بندوں کو اللہ تعالیٰ نے صحیح کام کی طرف توجہ کرنے کی توفیق و ہمت بخشی ہے وہ مسلمانوں کی تکفیر کی فکر میں نہیں ہیں، ان کی دعوت کا نقطۂ آغاز: اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، حقیقی ایمان لاؤ، ہے۔

جہاں سب ایک گندے حوض کے اندر گرے ہوئے ہوں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو نجس قرار دے اور اس کو سزا کا مستحق سمجھے، صرف گندگی کو گندگی بتانے اور اس سے باہر نکلنے کی جدوجہد کے لیے دعوت دینے کا حق ہے اور یہ کام جاری رہنا چاہیے، تا آنکہ مسلمانوں کو جو ہندوستان کو ایک دارالامن سمجھ کر چین کی نیند سو رہے ہیں، محسوس ہو جائے کہ یہ دارالامن نہیں ہے، بلکہ ایک ایسا مکان ہے جس میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا ہے، یا ایک سنڈاس ہے جس کے اندر بدبو سے سانس لینا دشوار ہے۔

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

انسان کی فطرت میں شرک نہیں ہے، جیسا کہ ہم آئندہ باب میں بیان کریں گے، اور مسلمان تو شرک کا تصور بھی نہیں کرسکتا، پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ فطرت جو وقت کی تاریکیوں اور یگانوں و بے گانوں کی تھپکیوں اور ان کے انجکشنوں کے اثر سے ماؤف ہو کر سو رہی ہے بیدار نہ ہو جائے اور انسان خدا کی سچی بندگی کی لذت سے پھر آشنا نہ ہو جائے۔

باب ۹

کیا شرک تقاضائے فطرت ہے

اس زمانہ میں ہر علم وفن کی تحقیق میں اصلی رہنما نظریہ ارتقاء خیال کیا جاتا ہے، تاریخ ہو یا قانون، معاشیات ہو یا سیاسیات، فلسفہ و مذہب ہو یا علم عمران وتمدن ہر ایک کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش کا شوق اس عہد کے ذوق پر اس درجہ غالب ہے کہ اس کے بغیر ہر علم ادھورا اور ناقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر علم وفن کا مدون سرمایہ، جو پوری روشنی میں موجود ہے، اپنی صحیح قدر و قیمت بتانے کے لیے نہ صرف ناکافی سمجھا جاتا ہے، بلکہ اکثر حالات میں وہ بالکل غلط اور مہمل قرار دے دیا گیا ہے، آج اصل شے یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس عہد میں تحقیق کی جائے جب انسان بالکل حالت طفولیت میں تھا اور جس کی کوئی لکھی ہوئی تاریخ ہمارے سامنے نہیں ہے، ظاہر ہے کہ یہ عہد ایک عہد ظلمت ہے، اس کی متعلق جو کچھ بھی کہا جائے گا اس کی حیثیت رجما بالغیب باتوں اور اٹکل کے تیر تکوں سے زیادہ نہیں ہوسکتی اس ظلمات میں خضر راہ آرکیالوجی (علم الآثار) اور بیالوجی (علم الحیات) کے ماہرین سمجھے جاتے ہیں جو زمین کے طبقات، چٹانوں کے پرت، غاروں کے اندر کے آثار و علامات، گڑی ہوئی ہڈیوں، ابتدائی زمانہ کے الآت واوزار اور قدیم انسان کے کھنچے ہوئے آڑے ترچھے نقوش کو علم کا اصلی سرمایہ قرار دیتے ہیں اور اس پر ظن وتخمین کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔

اس بات کا اعتراف سب کو ہے کہ اس کی حیثیت ظن وتخمین (GUESS WORK) سے زیادہ نہیں ہے، تاہم اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ ہر علم وفن میں وہی حقیقت ہے جو ان

مظنونات سے ہم آہنگ ہو جائے جو بات ان سے میل نہ پیدا کر سکے وہ بے اصل اور ارتقاء کی راہ میں گویا ایک غیر فطری بیرونی مداخلت ہے، جس کا وجود نہیں بلکہ عدم مطلوب ہے۔

اس خیال کے غلبہ کا اثر یہ ہوا ہے کہ ایک عرصے سے دنیا میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے جتنے دعوے ابھرے ہیں ان میں سے ہر ایک کو نظریہ ارتقاء کا سہارا لینا پڑا ہے، اور یہ اتنا مرنجاں مرنج واقع ہوا ہے کہ سب کے ساتھ اس کی ساز گاری رہی ہے، جمہوریت کے حامیوں نے انسان کی ابتدائی زندگی کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے کہ جمہوریت ہی کو انسان کا فطری تقاضا ثابت کر دیا ہے، ملوکیت کے ہمدردوں نے اس کی تقریر اپنے رنگ میں کر ڈالی ہے، نراج کے علمبرداروں سے ان بن ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے شاطر حامیوں نے شروع ہی سے اس میں اس کو ایک مخالف مذہب نظریہ کی شکل دے دی تا کہ اس کو ان مذاہب کی حمایت میں نہ استعمال کیا جا سکے جو اپنی مخصوص انفرادیت کے مدعی ہیں اور جو اپنے عقائد و مسلمات کی بنیاد وحی پر قرار دیتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے ساتھ کسی رواداری کے لیے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نظریہ کی آڑ میں ملاحدہ نے یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی جڑ اکھاڑنے کی پوری کوشش کی اور اس مقصد کے لیے مذہب کے ارتقاء کو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے جس سے آسمانی مذاہب کے تمام مسلمات ڈھے جاتے ہیں۔

یہاں ہم کو نظریہ ارتقاء کی تمام تفصیلات سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے، البتہ ہم اس کے اتنے حصہ سے تعرض کریں گے جس کا تعلق شرک و توحید سے ہے۔

یہ لوگ مذہب کے ارتقاء کی تقریر یوں کرتے ہیں کہ مذہب نے انسان کے اولین نقش قدم کے ساتھ قدم رکھا، جس وقت انسان نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ مجرد ایک جسم نہیں ہے، بلکہ اپنے اندر اس سے ایک برتر عنصر، روح بھی رکھتا ہے اسی وقت مذہب کی پہلی بنیادی اینٹ رکھ دی گئی، اس کی ابتدائی تشکیل دو عنصروں سے ہوئی، ایک جذبہ خوف، دوسرا تصور، خوف ان دیکھی قوتوں کا جن کے اندر انسان نے اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کیا اور جن کو زور و قوت میں اپنے سے کہیں بڑھ چڑھ کر پایا اور تصور اس بات کا کہ اس کی تعظیم اور

بندگی کرنی چاہیے۔

جس طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ جو جسم و جسمانیات سے تعلق رکھتی ہیں زندگی کے اس ابتدائی ذرہ سے وابستہ ہے جس نے مادہ کو زندگی کی حرکت بخشی ہے اسی طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ جو روح و روحانیات سے وابستہ ہیں، اس ذرۂ روح سے متعلق ہے جس کے جذبۂ خوف اور تصور کے باہمی تفاعل سے مذہب وجود میں آیا ہے۔ اس مذہبی تصور نے جب مذہبی عمل کی صورتیں اختیار کیں تو اس کے نتیجے کے طور پر مذہب کے فرائض اور اس کے رسوم و مناسک وجود میں آئے پس مذہب ایک عمل ارتقاء کا نتیجہ ہے، وہ زندگی کا ارتقاء تھا یہ روح کا ارتقاء ہے، اور جس طرح یہ بات معلوم ہے کہ زندگی ایک زمانہ میں رینگنے والے جانوروں کی شکلوں (LIFE FORM REPTILIOUS) میں چھپی ہوئی تھی اور درجہ بدرجہ انسان کی احسن تقویم میں بے نقاب ہوئی اسی طرح روح ابتدا میں مظاہر پرستی، اشیاء پرستی اور سحر و ساحری کی زنجیروں میں گرفتار تھی اور آہستہ آہستہ خالص خدا پرستی تک پہنچی۔

اس تقریر سے جو نتائج علمائے ارتقاء نکالتے ہیں وہ بھی ہم اپنے لفظوں میں بیان کیے دیتے ہیں۔

۱۔ مذہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ ہے، یہ خوف مظاہر قدرت سے پیدا ہوا، بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آندھیوں کے شور، آتش فشاں پہاڑوں کے ہولناک نظاروں نے انسان کو ڈرایا اور وہ ان کو زندہ قوتیں سمجھ کر ان کی آفتوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ان کی عبادت کرنے لگا۔

۲۔ خالص خدا پرستی کے تقاضائے فطرت ہونے کا دعویٰ غلط ہے، اگر ایسا ہوتا تو انسان خدا پرستی کی جگہ مظاہر پرستی اور اشیاء پرستی وغیرہ سے مذہب کا آغاز نہ کرتا اور نہ دنیا میں بت پرستی اور مردہ پرستی کی یہ کثرت ہوتی جو ہم تاریخ میں دیکھ رہے ہیں۔

۳۔ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے، اس پہلو سے اسلام اور یہودیت اور افریقہ کے وحشیوں کی سحر پرستی (VOODO WORSHIP) میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے تمام مذاہب

اور تمام عقائد مختلفہ میں رواداری کو اصل الاصول ہونا چاہیے۔

اوپر کی تقریر اس قدر دل کش تھی کہ اس نے ہمارے حال کے بعض علمائے دین کی کتابوں میں بھی جگہ پالی ہے، حالانکہ ہے یہ بالکل مہمل اور غلط، عقل ونقل دونوں اس کے خلاف ہیں۔

یہ بات کہ مذہب کا آغاز ان دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا ہے اور یہی جذبہ انسان کے جذبات میں اولین اور قدیم ترین ہے بالکل بے سروپا ہے، انسان میں جو خوف پایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت زوال نعمت کا اندیشہ ہے، انسان کو اپنی زندگی عزیز ہے، زندگی کا سروسامان عزیز ہے، اپنے بیوی بچے عزیز ہیں، اس لیے وہ ان چیزوں کی طرف سے اندیشہ میں ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں اس سے چھن نہ جائیں۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ ان چیزوں کے بارہ میں خوف واندیشہ میں مبتلا ہونے سے پہلے وہ ان چیزوں کے نعمت ہونے کا شعور رکھتا ہے اور پھر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ ان نعمتوں کی وجہ سے اس کو ایک منعم کا بھی شعور ہوا ہوگا اور پھر لازماً اس کے لیے شکر گزاری کا جذبہ اور عبادت کا تصور بھی پیدا ہوگا، اس لیے خوف سے پہلے نعمت اور منعم کا شعور ناگزیر ہے۔ جب تک ہمیں زندگی اور اس کے اسباب ووسائل کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو، اس وقت تک ہمیں زندگی کے متعلق کوئی خوف نہیں ہوتا، چنانچہ جو لوگ اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں وہ موت جیسی خوفناک چیز سے ذرا بھی نہیں ڈرتے، کتنے آدمی آگ میں کود پڑتے ہیں کتنے دریاؤں اور سمندروں میں ڈوب مرتے ہیں، جاپان میں کتنے ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں میں چھلانگ لگا کے ختم ہو جاتے ہیں۔

پس اگر ابتدائی انسان کو بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور طوفانوں کے شور سے کوئی خطرہ محسوس ہوا اور اسے اپنے آپ کو ان کے خطرات سے بچانے کی فکر لاحق ہوئی تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسے زندگی اور زندگی کے اسباب ووسائل کے نعمت ہونے کا شعور تھا، کیونکہ جب تک کوئی شے عزیز نہ ہو اس کی حفاظت کی فکر بالکل بے معنی ہے۔ خالی گھر میں

کوئی بھی قفل نہیں لگایا کرتا اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اسے ایک منعم کا بھی شعور تھا، کیونکہ نعمت کا وجود ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ وہ قدرت کے ان مظاہر کی اس ڈر سے عبادت کرنے لگا کہ وہ اس سے زندگی کی نعمت یا اس کے اسباب کہیں چھین نہ لیں تو اس سے زیادہ صحیح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان نعمتوں کے شعور نے اس کے اندر اپنے منعم کے لیے محبت اور شکر گزاری کا جذبہ بھی پیدا کیا ہوگا، پس ثابت ہوا کہ ایک منعم کا شعور، اس کی محبت اور شکر گزاری کا جذبہ اور اس کی عبادت کا تصور خوف کے جذبہ اور مظاہر قدرت کی عبادت کے تصور پر مقدم ہے۔

بہر حال انسان نے جب سے خوف کا احساس کیا ہے اس سے پہلے زندگی کے نعمت ہونے اور ایک منعم کا اور اس کی محبت کا احساس کیا ہے اور جس وقت اس کے تصور نے اس کو ورغلایا کہ وہ ان مظاہر قدرت کی عبادت کرے یقیناً اس سے پہلے جذبہ محبت سے ایک تصور نے ابھر کر اسے اکسایا ہوگا کہ وہ اپنے منعم کا شکر ادا کرے۔ اور محبت شکر گزاری کا یہ جذبہ وتصور توحید اور خالص خدا پرستی کی بنیاد رکھتا ہے، نہ کہ شرک کی، چنانچہ یہی راز ہے کہ قرآن مجید نے حمد وشکر کو انسان کی اولین صدائے فطرت بتایا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (الفاتحہ ۱:۱-۲) (شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب، رحمان اور رحیم)۔

ہمارے اس نظریہ کی تائید اس امر واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں وہ دنیا کے عامتہ الورود واقعات میں سے نہیں ہیں، زلزلے روز نہیں آیا کرتے، آتش فشاں پہاڑ روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روز نہیں کڑکتیں اور طوفانوں کا شور بھی کوئی روزمرہ کا واقعہ نہیں ہے، برعکس اس کے تارے روز چھٹکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، آسمان کی نیلگونی ہر لمحہ باصرہ نوازی کرتی ہے، چاند روپہلی چاندنی کی چادر دشت وجبل میں روز بچھاتا ہے، ابر کرم کی تر دستیاں اور درختوں کی ثمر باریاں ہر موسم میں موجود ہیں، پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہر قدرت کی گاہ گاہ کی گھرکیاں اور دھمکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کر دیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے لیکن منعم غیب کی یہ ساری

فیاضیاں بالکل بے اثر رہ جائیں اور انسان میں شکر وسپاس کا کوئی ولولہ نہ پیدا کریں!۔

بیالوجی کے علماء نے اس زمانہ کی دنیا کی تصویر بہت بھیانک کھینچی ہے اور یہ دکھانا چاہا ہے کہ اس وقت کے قدرتی مظاہر خوف ہی کے جذبہ کا باعث ہو سکتے تھے، لیکن یہ ایک صریحی مغالطہ ہے، اس زمانہ کی دنیا اگر بہت بھیانک تھی تو ظاہر ہے کہ اس زمانہ کا انسان بھی آج کا انسان نہ تھا، اگر اس وقت یہ کائنات اتنی حسین نہ تھی جتنی اب ہے تو اس وقت کا انسان اتنا جمال پرست بھی نہ تھا جتنا کہ اب ہے، اگر اس وقت یہ زمین آج کی طرح زرخیز ومعمور نہ تھی تو اس وقت کا انسان بھی آج کی طرح عشرت پسند اور مجلسی نہیں ہوا تھا اگر اس وقت خطرے اور تکلیفیں بہت تھیں تو آج کے انسان کی طرح اس عہد کا انسان نازک بدن اور تن آسان بھی نہ تھا۔ وہ ہر خطرہ سے بچاؤ کے لیے کوسوں بھاگ سکتا تھا، گلہریوں اور بندریوں کی سی چستی کے ساتھ درختوں پر چڑھ سکتا تھا، آگ جلا کر اور پتے سی کر اپنے جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیف سے بچا سکتا تھا، برف باری اور درندوں کی آفتوں سے بچنے کے لیے غاروں میں چھپ سکتا تھا، بھوک میں ہر طرح کے جانداروں کے شکار سے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا، اس لیے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اس وقت کے حالات خوف ہی کے جذبہ کی نشوونما کے لیے سازگار تھے اس میں حاضر کو ماضی میں داخل کر دینے کا مغالطہ چھپا ہوا ہے، زمانہ تو قدیم ترین دور حجری سے بھی پہلے کا فرض کر لیا گیا ہے اور انسان اس کے اندر اسی بیسویں صدی کا فرض کیا گیا ہے۔

بعض علمائے ارتقاء نے خاندان کے بڑے بوڑھے کے خوف کو انسان کے تمام ابتدائی تصورات (EARLY THOUGHTS) کی اصل قرار دیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک خاندان کے بزرگ کا یہ خوف بھی محبت ہی پر مبنی ہوتا ہے، بچوں کو تمام لذتیں اور تمام راحتیں ماں باپ سے حاصل ہوتی ہیں، اس وجہ سے وہ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس محبت ہی کی وجہ سے ان سے ڈرنے بھی لگتے ہیں پس یہ جذبہ بھی اپنی اصل کے لحاظ سے محبت ہی کا جذبہ ہے اور اس سے بلاشبہ ماں باپ کی تعظیم کا تصور پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی

چاہیے کہ بچہ جب تک بچہ رہتا ہے اس وقت تک تو بلاشبہ ساری کائنات باپ ہی کو سمجھتا ہے، لیکن جوں ہی وہ خود باپ بنتا ہے یا باپ بننے کے قابل ہو جاتا ہے اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ باپ کا وجود صرف ایک حد تک ہی اس کی لذتوں اور راحتوں کا کفیل ہے اس حد سے باہر قدم رکھنے کے بعد جو کچھ اسے حاصل ہوا ہے اس کا سرچشمہ کوئی اور ہے ان دیکھی ہستی ہے، یہاں تک کہ خود باپ کا وجود بھی اسے اس ان دیکھی ہستی کی بے پایاں بخشائشوں میں سے ایک بخشش معلوم ہونے لگتا ہے، پس جس جذبہ محبت نے اس کہ اندر باپ سے محبت تعظیم اور خوف کی وابستگی پیدا کی ہوگی لازماً اسی جذبہ نے بچپنے کے حدود سے نکلنے کے بعد اس کے اندر ایک ان دیکھی ہستی کے ساتھ محبت اور تعظیم اور خوف کی وابستگی بھی پیدا کی ہوگی، اگر انسان ہمیشہ دور طفولیت ہی میں رہتا تب تو مذہب بلاشبہ پدر پرستی ہی پر ختم ہو جاتا ،لیکن بچہ سیانا بھی ہوتا ہے اور مذہب سیانوں ہی کی ایجاد ہوسکتا ہے تو سیانوں کے اندر اگر باپ کے احسانات کی وجہ سے اس کی تعظیم اور اس کے وقار و احترام کا تصور پیدا ہوسکتا تھا تو اس سے بدرجہا اقرب ہے کہ ان عظیم احسانات کا اثر بھی اسی جذبہ و تصور کی شکل میں ظاہر ہو جن میں باپ کو کوئی دخل نہیں تھا، لیکن وہ موجود تھے اور باپ سے کہیں بڑھ کر کسی مہر و محبت والی ہستی ہی کے ہو سکتے تھے[1]۔

بہرشکل مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ محبت کے جذبہ سے ہوا ہے ،علمائے ارتقاء کے مذکورہ بالا دونوں نظریے باطل ہیں، پہلی صورت میں ایک منعم حقیقی کے شکر و محبت کا جذبہ اور اس کی عبادت کا تصور مقدم ہے اور غیر اللہ کے خوف کے جذبہ اور اس کی پرستش کا تصور ایک غیر فطری عارض کی طرح انسان کو محض سوء فہم اور اپنی فطرت کی صحیح

[1] مذہب کی اصل کے متعلق علمائے ارتقاء کے ہاں مقبول عام نظریے یہی دو ہیں اور انہی دونوں کو نسبتاً علمی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی وجہ سے ہم نے بھی انہی دونوں سے تعرض کیا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بعض نظریات ہیں، مثلاً بعضوں نے مذہب کا نقطۂ آغاز طوطمیت (TOTEMISM) کو قرار دیا ہے بعضوں نے اس کی اصل اوّل اوّل انسان پر کسی نشیلی چیز کے استعمال کے وجد انگیز اثر کو قرار دیا ہے، بعضوں نے اس کی بنیاد جنسی خواہشوں پر رکھی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ خرافات محتاج تردید نہیں ہے۔

آواز سے غفلت کی وجہ سے لاحق ہو گیا ہے اور دوسری صورت میں ہونا یہ چاہیے کہ انسان باپ کی محبت کا ہاتھ پکڑ کر خدا تک پہنچ جائے۔ اس کے اس جذبہ کا فطری ارتقاء اگر کوئی ہوسکتا ہے کہ وہ باپ سے مستغنی ہونے کے ساتھ ہی مجازی باپ سے حقیقی خالق تک پہنچ جائے اور اس کے ساتھ باپ سے زیادہ محبت کرے اور باپ سے زیادہ اس کی تعظیم بجا لائے، لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر سکا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارتقاء کی اصلی شاہراہ پر مارچ کرنے کے بجائے کسی اندھی گلی (BLIND ALLEY) میں جا پڑا اور یہ روحانی ارتقاء میں اسی طرح کا غیر فطری جمود ہے جس طرح کے غیر فطری جمود کی مثالیں ہمیں مادی زندگی کے ارتقاء میں ملتی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ قدیم ترین جذبہ والدین کی محبت کا جذبہ اور قدیم ترین تصور والدین کی تعظیم کا تصور ہے، لیکن یہ جذبہ، جیسا کہ واضح ہوا، بچہ کو بلوغ کے بعد خدا کی طرف لے جاتا ہے، نہ کہ آباء پرستی اور قبائلی دیوتاؤں کی طرف، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور تورات میں خدا کی عبادت اور والدین کے ساتھ احسان کا حکم ساتھ ساتھ ہوا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی فطرت میں خدا اور والدین کے حقوق کا شعور قدیم ترین ہے اور اگرچہ شعور میں والدین کا حق پہلے آتا ہے، لیکن درجہ میں خدا کا حق والدین کے حق پر مقدم ہو جاتا ہے، یہ ویسے ہی ہے جیسے بالا خانہ پر چڑھنے سے پہلے زینہ اوپر ہوتا ہے، لیکن اس پر پہنچ جانے کے بعد زینہ نیچے ہو جاتا ہے۔ خدا تک پہنچ جانے کے بعد انسان پر یہ راز کھلتا ہے کہ والدین بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہیں، ان کو پوجنا تو درکنار اس نعمت کے ملنے پر بھی خدا ہی کا شکر واجب ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے والدین کے لیے بیٹے پر تمام حقوق تسلیم کیے، لیکن ان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ بیٹے سے شرک کرائیں: وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (لقمان ۳۱:۱۵) (اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا، جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو ان کی بات نہ مانیو)۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فطرت کے اندر جو داعیہ حقوق والدین کے احترام اور ان کی

محبت وتعظیم کے لیے موجود ہے اس سے قوی تر داعیہ اللہ اور اس کے حقوق کے احترام اور اس کی محبت کے لیے موجود ہے، پھر والدین کو یہ حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے کہ جس جذبہ وتصور سے وہ ایک چیز پاتے ہیں بعینہٖ اسی جذبہ وتصور کے اس سے قوی تر مقتضی کا خدا کے بارہ میں وہ اپنی اولاد سے انکار کرائیں۔

بعض لوگوں کو یہاں ایک شبہ یہ ہوسکتا ہے کہ قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں جگہ جگہ اہل ایمان کی تعریف میں تقویٰ، خشیت اور خوف کا ذکر آیا ہے، اس سے علمائے ارتقاء کی اس بات کی تائید نکلتی ہے کہ مذہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ ہے لیکن یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہے، اسلام میں وہ خوف وخشیت معتبر نہیں ہے، جس کی بنیاد مجرد ضرر رسانی کے اندیشہ پر ہو، اس طرح کا خوف چنگیز، تیمور، شیر، ہاتھی، سانپ، بچھو ہر ایک چیز سے ہوسکتا ہے، اس طرح کا خوف اگر خدا سے ہو تو اس کی کیا وقعت ہے؟ مذہب میں جو خوف وتقویٰ مطلوب ومحبوب ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے، اس خوف وتقویٰ کی بنیاد محبت پر ہوتی ہے، یہ مجرد خدا کے قہر وغضب کے تصور سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے بے پایاں افضال وعنایات کے تصور اور اس کے اسمائے حسنیٰ کے تذکرے سے پیدا ہوتا ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کی اعلیٰ صفتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں وہی لوگ اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور جو اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہی اس سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر ۳۵:۲۸) (اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں)۔

ہماری اس بحث سے علمائے ارتقاء کے نظریہ کی تو پوری تردید ہوگئی کہ مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ اور مظاہر پرستی سے ہوا ہے، لیکن ایک شبہ یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت خالص خدا پرستی ہے اور اس کے ارتقاء کا اصلی رخ یہی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا میں کثرت سے شہادت بت پرستی اور مردہ پرستی وغیرہ ہی کی ملتی ہے؟ تاریخ کے عہد ظلمت کے آثار وقرائن بھی اسی بات کی گواہی دیتے ہیں اور جس عہد کا مدون سرمایہ ہمارے

ہاتھوں میں موجود ہے، اس کی شہادت بھی یہی ہے نصاریٰ پر پوری چھے صدیاں بھی نہ گزرنے پائیں کہ ان میں تصویر پرستی رائج ہوگئی، حالانکہ تورات میں اس کی سخت ممانعت تھی، یہود، باوجود یکہ تورات کا پہلا حکم توحید تھا، بار بار کھلم کھلا بت پرستی میں مبتلا ہوئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض توحید کے لیے وطن چھوڑا اور ایک سنسان جگہ میں اللہ واحد کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا، لیکن انہی کی اولاد نے بہت مدت نہیں گزری کہ اس گھر میں بتوں کو لا بسایا، جبکہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خالص توحید ہی انسان کی فطرت ہے لیکن واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہے تو اس کا جواب دینا ضروری ہے اسی جواب سے علمائے ارتقاء کے اس دوسرے نتیجہء بحث کی تردید ہوگی جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔

یہ بات کہ دنیا میں، ابتداء سے کثرت بت پرستی اور شرک ہی کی رہی ہے اور اب تک ہے، اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ شرک و بت پرستی انسان کی فطرت ہے، آدمی کا بچہ جب تک بچہ رہتا ہے سامنے کی ہر چیز بلا امتیاز اس کے کہ وہ اینٹ ہے یا پتھر، لکڑی ہے یا لوہا، پاک ہے یا ناپاک، منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ ماں کی چھاتی ہی ہے کچھ دیر تک اس کو چوستا ہے، پھر کوئی دوسری چیز اٹھا لیتا ہے، پھر کوئی تیسری چیز اٹھا لیتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ یہ ساری چیزیں بچہ کو فطرۃً مطلوب ہیں محض حماقت ہے، بچہ کی فطری غذا تو ماں کی چھاتی کے اندر ہوتی ہے، لیکن چونکہ اس کو ابھی پورا پورا امتیاز نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے وہ ہر چیز کو ماں کی چھاتی ہی خیال کرنے لگتا ہے، پس اگر انسان اپنے عہد طفولیت میں بت پرستی اور مظاہر پرستی وغیرہ کی نجاستوں میں آلودہ رہا تو اس کے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ یہی اس کی فطرت کا تقاضا تھا، بلکہ درحقیقت اس کی یہ ساری پریشانی و سرگردانی، معبود حقیقی کی تلاش میں تھی، اسی کی طلب نے اس کو تمام کوچوں کی خاک چھنوائی، بچہ کی یہ خصوصیت بھی قابل لحاظ ہے کہ بسا اوقات ماں اس کو پکارتی بھی ہے، لیکن وہ جس چیز میں مشغول ہوتا ہے اسی میں مشغول رہتا ہے، تا آنکہ ماں اسے گود میں نہ اٹھالے اور اپنی چھاتی اس کے منہ سے نہ لگادے۔ پھر جوں ہی اس کو سینہ سے الگ کردیتی ہے، وہ حسب سابق ہر

چیز منہ میں ڈالنے اور نگلنے لگ جاتا ہے۔

پس یہ بات بالکل مطابق عقل معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ کے عہد ظلمت میں بھی خدا کے ایسے بندے آئے جو خود بھی بیدار تھے اور جنہوں نے دوسروں کو بھی بیدار کیا لیکن تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد، جیسا کہ بچوں کی فطرت ہے، کھلونوں کی دلچسپی عود کرتی رہی اور انسان کی جستجو اپنا مدعا پاپا کے کھوتی رہی۔

یہاں پہنچ کر بعض لوگوں کو ایک اور شبہ بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ جو چیز انسان کی فطرت ہے چاہیے کہ وہ اسی پر پیدا ہو، اسی پر بڑھے اور اسی پر مرے یہ پاپا کر کھونا اور کھو کھو کر پانا کیا معنی؟ کم از کم یہ تو ہو کہ جستجوئے بسیار کے بعد جب پا جائے تو پھر اسے نہ کھو سکے۔

یہ شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ حیوانات کی جبلت اور انسانوں کی فطرت کے فرق کو نہیں سمجھتے، حیوانات کی جبلت اپنے بندھے ٹکے قاعدے رکھتی ہے، اگر کوئی طبعی خلل نہ واقع ہو تو انہی قاعدوں پر ابھرتی، نشو ونما پاتی اور اپنے مقرر درجہ کمال تک پہنچتی ہے، قدرت نے ان کو اس سے انحراف کرنے، اس کو بدل دینے، یا اس میں ترقی کرنے کا موقع نہیں بخشا ہے، وہ اپنے دھڑے کے پابند اور اپنے طبعی نظام کے اندر جکڑے ہوئے ہیں ایک کبوتر کو اگر آپ گوشت کی دکان کے اندر بند کریں تو وہاں وہ بھوکا مر جائے گا، لیکن گوشت کے سارے ذخیرے سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ ایک بلی کو اگر آپ پھلوں کی الماری کے اندر بند کریں تو وہ بھی بھوکی مر جائے گی، لیکن پھلوں کے ذخیرہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گی، لیکن انسان کی فطرت اس سے بالکل مختلف ہے یہاں ہم انسانی فطرت کی نوعیت واضح کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ مستعار لے لیتے ہیں جو انہوں نے تفسیر سورۂ اخلاص میں مذکورہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھے ہیں اور سورۂ روم کی آیات ۴۸-۵۴ کی روشنی میں لکھے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

حکمت اور رحمت کی نشانیاں جو انسان کو تمام عالم میں نظر آ رہی ہیں اور اپنے رب کی

طرف کشش، جسے وہ مصیبت کے وقت محسوس کرتا ہے بتا رہی ہیں کہ کسی حاکم مطلق ہستی پر اسے اپنے اندر اور باہر سے گواہی مل رہی ہے، ایسی کوئی شہادت بتوں یا مردوں کے لیے نہیں ملتی، اگر انسان کی فطرت مثل اور حیوانات کے نہیں۔ وہ غلام بنائے گئے اور اس کو آزادی بخشی گئی جس کا لازمہ تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ترقی کرے۔ پس ان کو جس ڈگر پر چلانا تھا ہانک دیا اور ویسے ہی چل رہے ہیں مگر انسان کو چراغ عقل اور توشہ قابلیت دے کر میدان عالم میں چھوڑ دیا پس اس کی فطرت اس کی قابلیت ہے۔ جس قدر انسان نے آج تک ترقی کی ہے یہ سب اس کی قابلیت ہی کے آثار ہیں اور اس کی قابلیت ہی کے برگ وبار۔ یہ امر کہ قابلیت کا نام فطرت ہے، کچھ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں، بچہ طاؤس جو ایک مضغہ گوشت ہے جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پروں کی گلکاری کو ہم فطرت ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بچہ انسان جو اکثر جانوروں کی نسبت زیادہ ضعیف الجثہ ہے اور اس سے بڑھ کر ضعیف العقل ہے جب اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو کیا اس کی دانائی اور توانائی کو ہم اس کی اعلیٰ فطرت کا نتیجہ نہ سمجھیں؟ پس انسان اور دیگر چیزوں میں فطرت کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ اس کی فطرت میں ایک جداگانہ بات ہے، جو اوروں میں نہیں یہ اوّل میں نہایت کمزور اور بے حقیقت ہوتا ہے، مگر آخر میں سب پر فائق ہو جاتا ہے، اس کی طاقت کی تھاہ اب تک نہیں ملی، مگر یہ سب دونا توانیوں کے درمیان ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان سے دعوائے فرعونی بھی ناموزوں نہ ہوتا، پس محض اس بات سے کہ انسان کی فطرت ترقی کے انتہائی مراحل طے کرتی ہے، یہ امر قرین قیاس ہے کہ وہ اکثر غلط راستہ پر پڑ جائے، پس آزادی رائے اور پھر درازی راہ اس کے حصہ میں آئی۔ ان دو مشکلوں کے ساتھ ایک تیسری مشکل بھی لگ گئی، جو ان دونوں سے کبھی جدا ہو ہی نہیں سکتی، یعنی انسان نیکی اور بدی کے دوراہہ پر کھڑا کیا گیا، جس کے بغیر اس کے حق میں آزادی لفظ بے معنی ہوتی اور ترقی مراتب کے لیے عرصہ تنگ ہوتا۔ پس کوشش اور کشمکش انسان کی فطرت کا لازمہ ہوا اور نیکی اور بدی کی کشمکش میں آگے بڑھنا اور نفس امارہ اور عقل آوارہ کو جادۂ طاعت پر لانا اس کا فریضہ ٹھہرا۔

''انسان کو خدائے تعالیٰ نے ان دقتوں میں ڈال کر اس کی دست گیری کا وعدہ کیا ہے، اس کے اندر اور باہر سامان ہدایت موجود کر دیے ہیں، جس طرح بچۂ ناتواں کے لیے ماں کا آغوش مہیا کیا، اسی طرح نوع انسان کے لیے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ جو خدا زمین مردہ کو بارش سے سیراب کرتا ہے وہی خدا اپنے کلام سے دلوں کو آباد کرتا ہے جس طرح وہ بعضے بلند پہاڑوں میں سے قدرتی چشمے نکالتا ہے، اسی طرح بعض اعلیٰ دلوں میں سے الٰہی کلمے جاری فرماتا ہے، پس اس قدر سامان مہیا کر دینے کے بعد اگر انسان خدا سے روگردان ہو تو یہ نتیجہ فطرت نہیں، بلکہ اس کی غفلت ہے۔ اگر تاریخ سے بت پرستی کی مثالیں ملتی ہیں تو اس سے کہیں زیادہ پرزور اس کے ابطال کی مثالیں ملتی ہیں، توحید پر شرک کا غبار آہستہ جمتا ہے، مگر توحید کا ذرا سا چمکارا شرک کی ظلمت پر غالب ہو جاتا ہے، جس سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکلتا ہے کہ فطرت انسانی کو توحید سے مناسبت ہے، ورنہ وہ کیوں اس طرف تیزی سے دوڑتا اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کھسکتا ہے۔''

اس تقریر سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ انسان کی فطرت اور حیوانات کی جبلت میں چند بنیادی فرق ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ فطرت اور اعلیٰ خلقت کے ساتھ آزادی بھی ملی ہے اس آزادی کی وجہ سے، وہ اگر چاہے تو احسن تقویم میں ہونے کے باوجود اسفل سافلین کے گڑھے میں گر جائے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کی قوتیں اور قابلیتیں اتھاہ ہیں، اس کو ترقی کی ایک لمبی منزل طے کرنی پڑتی ہے حیوانات کی طرح اس کا راستہ کوس دو کوس کا نہیں ہے کہ چلے اور پہنچ گئے، اس درازی راہ اور آزادی رائے کے ساتھ اس کا گرنا اور اٹھنا، ڈوبنا اور اچھلنا، بالکل قدرتی بات ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ آزادی رائے اور درازی منزل کے ساتھ ساتھ اس کی آزمائش بھی کی گئی ہے اس کے سامنے دنیا کو نقد، آخرت کو نسیہ، نیکی کو دشوار، بدی کو آسان، حرام کو لذیذ اور کثیر،

اور حلال کو بے مزہ اور قلیل، ثمرۂ حق کو آجل، اور نتیجہ باطل کو عاجل، حقیقت کو مستور، اور وہم وفریب کو دلکش اور پر جمال بنا کر رکھ دیا گیا ہے، تاکہ اس کا امتحان ہو کہ وہ خیر کی طرف لپکتا ہے یا شر کی طرف، اپنی فطرت کے مخفی مگر پر حقیقت اشاروں کی طرف بڑھتا ہے یا نفس کی خلاف فطرت مگر پر فریب دعوتوں کی طرف، بلاشبہ یہ امتحان بڑا کڑا ہے، لیکن فطرت کا نفس لوامہ بھی ضعیف نہیں ہے، وہ ہر تاریکی کے اندر جھانکنے کی راہ پیدا کر لیتا ہے اور انسان کی رہنمائی کے لیے اشارے کرتا ہے اور آدمی محسوسات کے کتنے ہی نقاب اپنے اوپر ڈال لے، لیکن اس کے اشارے دیکھتا اور اس کی صدائیں سنتا ہے، اگرچہ اس کی صدائیں سنتے ہوئے اس کی نافرمانیاں کرتا ہے اور اس کی حجتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے لیے عذرات تلاش کر لیتا ہے، یہی حقیقت ہے جو سورۂ قیامہ کی آیات وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیامۃ ۷۵:۲) (اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی!)۔ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (القیامۃ ۷۵:۵) (بلکہ انسان اپنے (ضمیر کے) آگے شرارت کرنا چاہتا ہے) اور بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ﴿۱۴﴾ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (القیامۃ ۷۵:۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے) میں بیان ہوئی ہے اور تفصیل اس اجمال کی استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر سورۂ قیامہ میں دیکھنی چاہیے۔

امتحان کی یہ سختی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے انبیاء مبعوث فرمائے، ہر چند فطرت کی کشش خدا کی طرف ضعیف نہیں تھی لیکن دنیا اور اس کی گیرائیاں، نفس اور اس کی فریب کاریاں، شیطان اور اس کی دل ربائیاں بھی اپنے اندر اتنا وزن رکھتی تھیں کہ رحمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ اس کسر کا جبر مہیا کرے اور نفس کے پہلو پر جو ثقل ہے اس کی تلافی فطرت کے پلڑے میں پاسنگ رکھ کے کر دے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو شیطان کے ساتھ اس آزمائش گاہ دنیا میں اتارا تو ساتھ ہی اپنی ہدایتیں اور اپنے انبیاء بھیجنے کا وعدہ فرمایا: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى (البقرہ ۲:۳۸) (تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت) تاکہ اس میدان مقابلہ میں انسان کی

فطرت تنہا نہ پڑ جائے، بلکہ اس کے ساتھ اللہ کے نبیوں، اس کی کتابوں اور اس کے ملائکہ کی نصرت بھی ہو، یہ فطرت کی تائید میں ایک مزید کمک مہیا کی گئی، جس کے بعد انسان پر اللہ کی حجت تمام ہوگئی اور اس کی ہدایت کا معاملہ اتفاق و امکان پر نہیں رہ گیا، اب اس کے لیے قیامت کے دن یہ عذر باقی نہیں رہا کہ تاریکی اتنی سخت تھی کہ اس سے اپنی فطرت کے مدھم نقوش پڑھے نہ جا سکے۔ بلاشبہ تاریکی سخت تھی، لیکن نور مبین اور سراج منیر بھی موجود تھے، جو فطرت کے باریک سے باریک نقوش کو اجاگر کر رہے تھے۔

قدرت کسی گوشہ میں بھی اپنی فیض بخشیوں میں بخیل نہیں ہے، یہ ممکن تھا کہ انسان کو سننے کے لیے ایک ہی کان دیا جاتا، یا دیکھنے کے لیے ایک ہی آنکھ ملتی، لیکن قدرت نے دو کان بخشے اور دو آنکھیں عنایت کیں، اسی طرح یہ ممکن تھا کہ انسان کی رہنمائی اس کی فطرت ہی پر چھوڑ دی جاتی، لیکن رحمت الٰہی نے اس معاملہ کو امکان و اتفاق پر نہیں چھوڑا، بلکہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہدایت کا بہتر سے بہتر سامان مہیا کر دیا۔ اندر اور باہر کی اتنی قوتیں رکھنے کے باوجود اگر انسان خدا پرستی کی حمایت میں شیطان سے لڑنے کے لیے تیار نہ ہوا، بلکہ اس کے ساتھ اس نے سازگاری ہی چاہی تو ظاہر ہے کہ یہ فطرت کی خرابی نہیں ہے، بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں جو ان شاء اللہ تفصیل کے ساتھ آئندہ باب میں بیان ہوں گے۔

اس تقریر کے بعد اب اس بات کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ نہیں ہے، بلکہ محبت الٰہی کا جذبہ ہے اور شرک و بت پرستی کی بنیاد ایک بالکل دوسری ہی شے ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی، پس اسلام ـــــ اور تمام مذاہب حقہ کا اصلی نام اسلام ہے اور یہی ابتدائے آفرینش سے خدا کا اصلی دین ہے ـــــ اور شرک و بت پرستی میں اصل و نسل کا فرق ہے اور ان کا قدرتی تعلق صلح و آشتی کا نہیں، بلکہ نفرت و عداوت کا ہے ایک فطرت کا ارتقاء ہے، دوسرا فطرت کی

رجعت قہقری، دونوں کی سمت سفر اور منزل مختلف ہے، ان میں رواداری اور مسالمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دنیا میں انسان محض جینے نہیں آیا، اس لیے آیا ہے کہ اس کی فطرت میں جو اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت ہیں ان کو ارتقاء کے اس نقطۂ کمال تک پہنچا دے، جہاں تک وہ اس عالم آب وگل میں رہتے ہوئے پہنچ سکتی ہیں، اسی مقصد کے لیے انسان کو دنیا میں جینے کی ایک مہلت ملی ہے اگر یہ مقصد پورا نہ ہو رہا ہو تو اس کا جینا لاحاصل اور اس کا زندہ رکھنا عبث ہے اور قدرت جو ہر گوشہ میں نہایت حکیم واقع ہوئی ہے وہ ایک کار عبث نہیں کر سکتی انسان کے ارتقائے روحانی کا نقطۂ آغاز، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، خالص خدا پرستی کا جذبہ ہے، جب انسان اپنے رخ پر بڑھ چلتا ہے تو وہ ارتقائے روحانی کی اصلی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے اگر اس سے اس نے رخ پھیر لیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارتقائے فطری کی راہ کے خلاف بہ چلا ہے چونکہ قدرت حد درجہ مہربان ہے، اس لیے اس نے فطری ہدایت بخشنے کے ساتھ ساتھ اس کا بھی سامان کیا ہے کہ وہ اپنے انبیاء ورسل بھیجتی رہی ہے، جو انسانوں کو ان کے ارتقاء کی صحیح سمت میں ہانکتے رہے ہیں یعنی ان کو خالص خدا پرستی کے نقطہ تک لانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

انبیاء کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ جس گروہ کی طرف بھیجے جاتے ہیں اس کے نخل فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں، بہترین سیرت رکھتے ہیں، بہترین کلام سناتے ہیں، بہترین عمل دکھاتے ہیں اور ایک طویل مدت تک ایک اعلیٰ ترین فطرت کا مظاہرہ کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک بہترین جماعت تیار کر دیتے ہیں، جو فطری ارتقاء کی اصل شاہراہ پر اپنا مارچ بھی شروع کر دیتی ہے، اب اس کے بعد بھی اگر کچھ بلیدا ایسے ہیں جن کے کان فطرت کی صداؤں اور نبی کی نداؤں سے بالکل غافل ہیں تو ان کو قدرت کس کام کے لیے باقی رکھے! انسان بنا کے محض جینے، کھانے پینے اور بچے پیدا کرنے کے لیے تو ان کو رکھ چھوڑنا لاحاصل ہے، اس کے لیے حیوانات موجود ہی ہیں جو یہ سارے کام بھی کر

رہے ہیں اور اپنے سے برتر نوع کی خدمت کر کے ارتقاء کی شاہراہ پر بڑھ بھی رہے ہیں ان کی ہدایت کے لیے جو جتن کیے جا سکتے تھے وہ کیے جا چکے۔ اب صرف یہ چیز باقی رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے یا تو حقائق کے تمام پردے اٹھا دے اور انہیں تمام عالم غیب وشہادت کی سیر کرا دے یا ہدایت پر مجبور کر دے۔ لیکن یہ اکراہ اور کشف حجاب اس آزادی اور اس قانون آزمائش کے خلاف ہے، جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، تو اب قدرت ان کو کس کام کے لیے جینے کی مہلت دے؟ یہ انسان بجز اس کے اب کیا کرے گا کہ جس غلط راہ پر خود چل پڑا ہے اسی پر ان کو بھی چلائے گا، جن پر اس کا قابو چلے گا اور ان کو بھی جو اس کی صلب سے پیدا ہوں گے: اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح ۷۱:۲۷) (اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نابکاروں اور کافروں ہی کو جنم دیں گے)۔

اسی وجہ سے جن قوموں کے اندر انبیاء اور رسل بھیجے گئے، ان کے بارہ میں خدا کا قانون یہ رہا ہے کہ تکمیل دعوت اور اتمام حجت کے بعد ان کے صالحین کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا اور ان کے فاسقین و اشرار کو عذاب الٰہی کے ذریعے سے، یا اہل حق کے ہاتھوں ختم کر دیا گیا اور بقائے اصلح کا قانون اسی کا مقتضی ہے۔

یہ سنت اللہ انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے متعین ضوابط ہیں جو قرآن حکیم میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۂ کافرون میں اس پر اجمالی اشارات ملیں گے، انبیاء کے علاوہ دوسرے اشخاص اور دوسری جماعتیں اس درجہ کا اتمام حجت نہیں کر سکتے کہ یہ طے ہو جائے کہ اب اس قوم میں قبول ہدایت کی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے، اس لیے ان کو یہ حق نہیں ملا کہ وہ غیر صالح افراد کو ختم کر دیں، حالانکہ ایک شخص نے قبول ہدایت کے بعد رجعت و ارتداد اختیار کیا ہو، کیونکہ اس کا ایک مرتبہ ہدایت کو قبول کرنا ہی اس امر کا ثبوت ہے، کہ اس پر حق روشن ہو چکا ہے، ان کو غیر صالح افراد کے باب میں صرف یہ حق ملا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے قیادت کی

باگ چھین کر ان کو اپنی ماتحتی میں رکھیں، تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلانے کے بجائے، ایک صالح قیادت میں رہ کر اور ایک سازگار ماحول میں پل کر، اگر کچھ گنجائش ہے تو اپنی اصلاح کر سکیں۔

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مذہب کا آغاز محبت کے جذبہ سے ہوا، جو بچہ کی فطرت میں والدین کے لیے اور بالغوں کی فطرت میں والدین کے سوا منعم حقیقی کے لیے پیدا ہوا، اس محبت سے منعم حقیقی کے لیے شکر و حمد کا اور والدین کے ساتھ احسان کا جذبہ پیدا ہوا، منعم حقیقی کی حمد کے جذبہ نے اللہ کی عبادت کا تصور پیدا کیا جس نے نماز کی صورت اختیار کی اور والدین کے ساتھ احسان کے جذبہ نے ان کی خدمت اور ان کے لیے انفاق کا تصور پیدا کیا۔ جس نے ترقی کر کے ایتاء ذی القربیٰ اور زکوٰۃ کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح روح انسانی کا ارتقاء شروع ہوا، حقوق اللہ کی ادائیگی کے تصور نے تمام عقائد و عبادات کو استوار کیا اور حقوق العباد کی ادائیگی کے تصور نے تمام اخلاق و معاملات کو استوار کیا، یہ فطرت اور خدا پرستی کی صراط مستقیم ہے، یہی ارتقائے روح کی اصل شاہراہ ہے۔ اس کے ایک سرے پر ابو نا آدم علیہ السلام ہیں اور دوسرے پر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس کے بیچ میں وسط راہ پر، خدا کے ہزاروں لاکھوں انبیاء و رسل اور داعیانِ حق، تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کھڑے ہیں، انہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اسی راہ پر چلنے کی دعوت دی، لیکن انسان بار بار اس راہ پر آ کر اس سے منحرف ہوتا رہا اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابیاں پیدا کرتا رہا، چنانچہ ہر نبی کو یہ کہنا پڑا، وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف ۷:۵۶) (اور ملک میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو)۔

باب ۱۰

شرک کا اصلی سبب

پچھلے باب میں یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ انسان کی فطرت کے اندر ایک منعم حقیقی کی محبت اور اس کے حمد و شکر کا جذبہ سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ راسخ ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور ہر ابن آدم نے ''بلیٰ'' کہہ کر اس عہد و اقرار میں شرکت کی ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛؕ شَهِدْنَا ۛؕ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ (الاعراف ۷:۱۷۲)

''اور یاد کرو، جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ـــــ ان کی پیٹھوں سے ـــــ ان کی ذرّیت کو، گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے: ہاں، تو ہمارا رب ہے، ہم اس کے گواہ ہیں یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔''

بعض لوگ اس پر شبہ وارد کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہے ہمیں نہ تو اس ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' کے سوال کی کوئی خبر ہے اور نہ یہی یاد ہے کہ ہم نے ''بلیٰ'' کہہ کر کسی عہد کی ذمہ داری اٹھائی ہے، یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں، بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہے کہ قیامت کے دن بہر شکل یہ عہد ہر ابن آدم پر حجت ہوگا۔

حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا یہ بات نہیں معلوم ہے کہ ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے، ماں نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر اور کتنے دکھ اٹھا

کر، نو مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے اپنے گوشت وخون سے اس کی پرورش کرتی ہے ، پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغہ ٔ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے، پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جان کا ہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے، اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں، اس کی غور پرداخت اور تربیت ونگہداشت کا دور آتا ہے، جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے، اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے، اس سے زیادہ بچہ کے لیے چاہتا ہے، وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ بچہ کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچہ کو آرام پہنچائے وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ ہر خطرہ سے محفوظ رہے، ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جانبازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے، اب فرض کیجیے بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے، اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی، لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق وفرائض یاد دلاتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ ماں باپ کے کچھ حقوق وفرائض بھی ہیں، مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے، میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے تو کیا اس کا یہ جواب معقول ہوگا؟ ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا۔ کیونکہ وہ ایک ایسے حق اور ایسی ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت حق اور مسلم ذمہ داری کوئی اور نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری ہر [illegible] کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہے، یہ بغیر تحریر کے نوشتہ، بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبہ [illegible]سلم ہے، یہ استحقاق (PRIVILEGE) اور ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کا وہ فطری عہد ہے جس سے زیادہ انسان پر ہے کسی عہد کی بھی پابندی عائد نہیں ہوتی۔

اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان نفقہ اور حفاظت وحرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے متمتع ہوتا ہے، اسی بنیاد پر آدمی پر اس کے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت ونصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں، اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی اپنے شہریوں کی کمائی میں حصہ

دار بنتی ہے اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعایا سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، اپنے وقت اور آزادی اور اپنے جان و مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود خطرہ میں پڑ جائے تو رعایا اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دے۔

اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک بن بیٹھا، لیکن اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق و فرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کے حفظان صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی الٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے، اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے، لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا، یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے، اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری تو بنا ہوا ہے، لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ کی ذمہ داری سے بری ہوں، میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کی جوکھم میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا تو کیا اس کے جوابات صحیح ہوں گے؟ بیوی کہے گی یہ عذر غلط ہے جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا، اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک میثاق غلیظ کیا ہے اور زبان خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی، یہی جواب ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی جواب ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو، ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی اور تمام دنیا اس جواب کو بالکل جائز اور ایسے کمینوں کے لیے ہر سزا کو بالکل واجبی قرار دے گی۔ کیونکہ ہر استحقاق کے ساتھ ذمہ داری کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔

اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی، ہمارے تھان پر بندھی ہوئی گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں لگے ہوئے پودے اور ہمارے باغ میں اگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں اور ہم نہایت لئیم ٹھہریں گے، اگر ان حقوق کا انکار کر دیں، جس مرغی کے انڈے اور چوزے ہم کھاتے ہیں، لازم ہے کہ بلیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں، ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں، ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں، ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں، ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، ان کو گوڑیں اور ان کو کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لُو کی مصیبتوں سے ان کو بچائیں، ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی، اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کر لیا، یہ استحقاق اور ذمہ داری کا عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں ہے۔

اب غور کیجیے کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار کا حق نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو پیدا کیا ہے۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا! جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہی اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہد ربوبیت کا اقرار کریں جب ہم مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں، گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق و ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو، جس نے گائے اور گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند،

ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے ساز گار اور نفع رساں بنایا۔[1]

پس یہ بات تو بالکل غلط ہے کہ انسان کو اس عہد کا علم نہیں ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ اس عہد سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے، ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی محبت اور طلب کا جذبہ دے کر اس کی راہ میں خوف اور طمع، رغبت اور رہبت کے بہت سے عقبات ڈال دیے ہیں تاکہ اس کے اختیار و آزادی کا امتحان ہو اور ہر شخص اپنی ہمت و قابلیت کے اعتبار سے خدا کے یہاں درجہ اور عزت حاصل کر سکے، یہی عقبات ہیں جو ایک طالب صادق اور ایک بوالہوس کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہیں جو اہل ہمت ہوتے ہیں وہ تو ہر پست و بلند اور ہر سہل و صعب کو طے کرتے ہوئے خدا تک پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں۔ نہ راہ کے کسی خطرہ کی پروا کرتے اور نہ کسی طمع کی طرف ملتفت ہوتے ہیں وہ اپنی فطرت کی صدائے جرس برابر سنتے ہیں اور اس کی کشش انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ تلوے کے آبلوں اور کانٹوں کی جلن اور چبھن کا خیال کر سکیں، لیکن جو پست ہمت اور دنی الفطرت ہوتے ہیں وہ ان عقبات میں سے کسی عقبہ کے پاس ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں، بس یہی دناءت اور پست ہمتی ہے جو درحقیقت غیر اللہ کی بندگی اور شرک کا اصلی سبب ہے، انسان اپنے درجہ اور علوئے منصب کا خیال نہیں کرتا اور جہاں کوئی گھنی چھاؤں یا کوئی خطرہ دیکھتا ہے وہیں کمر کھول کر بیٹھ جاتا ہے یہ دناءت اور پست ہمتی جن گوناگوں شکلوں میں ظاہر ہوئی ہے اور اس نے انسان کو جس جس طرح غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا کیا ہے، اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، لیکن ذہن میں اس کا تصور پیدا کرنے کے لیے چند ضروری باتیں یہاں ہم ذکر کریں گے۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کیجیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات کے اندر ایک

---

[1] یہاں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ گیتا میں اس شخص کی مثال چور سے دی گئی ہے جو خدا کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، لیکن اس کے لیے قربانی نہیں کرتا ہے۔

چھوٹی سی بادشاہی بخشی ہے اس کے وجود کی تقویم اس طرح فرمائی کہ اس کو بہترین قابلیتوں اور بہترین قوتوں سے آراستہ کیا، اس کو کھانے پینے، اور رڑھنے پہننے، بیوی بچے، گھر گرہستی کی خواہشیں دیں تا کہ ان خواہشوں کی تحریک سے وہ اپنی بقائے ذات اور بقائے نوع کی قابلیتوں کو بروئے کار لا سکے، اس کو عقل عنایت فرمائی جو خیر و شر میں امتیاز کرنے والی ہے دل عنایت فرمایا جو بلند ارادوں کا مخزن ہے، روح عنایت فرمائی جس میں اپنی طلب و جستجو ودیعت کی اور سب پر اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان سب پر حکومت کرے اور ان کو اپنے رب کی رضا کی راہ میں استعمال کر کے خدا کے یہاں بلند سے بلند تر مرتبہ حاصل کرے، لیکن اس نے دیکھا کہ اس کو جتنی چیزیں ملی ہیں ان میں خواہشیں سب سے زیادہ لذیذ ہیں، ان کی لذت نقد اور ان کا نفع عاجل ہے پس وہ ان کا اس درجہ گرویدہ ہوا کہ اس نے اپنی ساری سلطنت ان کے حوالہ کر دی۔ اس نے اپنے حواس خمسہ کو حکم دیا کہ وہ خواہشوں کی اطاعت کریں اور جو کچھ انہیں مطلوب ہے صرف اس کی تلاش میں اپنے آپ کو سرگرم رکھیں، اس نے عقل کی عدالت معطل کر دی تا کہ ان خواہشوں کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہو سکے۔ اس نے دل کو بھی ان خواہشوں ہی کے تصرف میں دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بس وہ بطن و فرج کا بندہ بن کر رہ گیا اور اس کی مثال بالکل اس بادشاہ کی ہوگئی جو اپنی کسی لونڈی پر اس درجہ فریفتہ ہو جائے کہ اپنے آپ کو اور اپنی پوری مملکت کو اس کے امر و نہی کے حوالہ کر دے اور اس کی سلطنت کے تمام شرفاء و علماء اور تمام مدبرین ملک و اعضائے سلطنت اس لونڈی کے غلام بن کر رہ جائیں یہ ''اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ'' (الجاثیہ ۴۵: ۲۳) (کیا دیکھا تم نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے) کی صورت ہوئی اور ظاہر ہے کہ انسان کی فطرت نہیں بلکہ اس کی دناءت کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ماں باپ بنائے، بیوی بچے بخشے، خویش و اقارب دیے، کنبہ و خاندان اور قبیلہ و قوم کی جمعیت بخشی، مال و جائداد عنایت فرمائی، جانوروں کے گلے دیے تا کہ انسان ان کے اندر اور ان کے ذریعہ سے اپنی ان مدنی و اجتماعی قابلیتوں کو بروئے کار

لائے جو اس کے اندر ودیعت ہیں، اور اس مدنیت فاضلہ کی تخلیق کرے جس کا وہ خدا کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے اہل ہے۔ لیکن انسان نے ان سارے وسائل مقصد کو اصل مقصد بنا لیا۔ وہ ماں باپ کی محبت میں ایسا مستغرق ہوا کہ اس نے پدر پرستی کی بنیاد ڈال دی۔ بیوی بچوں کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ اس کے حکموں کو بھول گیا۔ کنبہ و خاندان اور قبیلہ کی عصبیت میں اتنا پھنس گیا کہ ان کے لیے خدا اور اس کے رسولوں سے بغاوت کر بیٹھا۔ یہاں تک کہ اس محبت کے غلو میں اس نے آباء پرستی اور قبائلی دیوتاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ وہ مال و جائداد کے عشق میں ایسا مبتلا ہوا کہ انہی کو معبود خیال کرنے لگا، حد یہ ہے کہ جن جانوروں کو اس نے نافع پایا ان کو بھی اس نے دیوتا بنا لیا۔ گائے، بیل، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ، سب اسی طرح اس کے دیوتا بن گئے، اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بطور مرکب اسے عنایت کیں ان کو اس نے راکب بنا لیا اور جو چیزیں بطور کمند کے دیں کہ ان کے سہارے سے خدا تک پہنچ سکے، ان کمندوں کو اس نے اپنے پاؤں اور اپنی گردن میں پھندا بنا کر ڈال لیا۔

اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں ایسی بخشیں جو انسان کے لیے یکسر نفع ہی نفع تھیں، اپنی نفع رسانیوں کے عوض میں، بیوں بچوں، قوم و قبیلہ اور گائے گھوڑے کی طرح آدمی سے کسی حق اور ذمہ داری کا مطالبہ نہیں کرتی تھیں، مثلاً سورج، چاند ستارے، قوس قزح، ابر، ہوا، آگ، پانی، زمین، دریا، پہاڑ، فضا کی چڑیاں وغیرہ۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے عنایت فرمائی تھیں کہ انسان ان کے وجود سے متمتع ہو اور ان کے حقوق کی ذمہ داری سے بالکل بے فکر رہ کر اپنے اوقات صرف رضائے مولا کے کاموں میں مشغول رکھ سکے، لیکن انسان نے جب دیکھا کہ اتنے نافع ہونے کے باوجود یہ اس سے کسی عوض کے طلب گار نہیں ہیں تو ان کی اس مفت فیض رسانی پر ایسا ریجھا کہ ان میں سے ہر نعمت کو اس نے منعم کا درجہ دے کر اس کی عبادت شروع کر دی، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے کسی مقرب خاص کو بہت سے غلام اور لونڈیاں عنایت کرے اور ان کی ساری ذمہ داریاں بھی اپنے سر لے تاکہ وہ مقرب خاص اپنی اور اپنے خدام کی ساری ذمہ داریوں سے بالکل

سبکدوش رہ کر اپنی ساری توجہ صرف سلطنت کے امور مہمہ پر صرف کر سکے، لیکن وہ مقرب خاص ان غلاموں اور لونڈیوں کی اس بے مزد و بے صلہ خدمات پر اس طرح ریجھ جائے کہ ان ہی کو بادشاہ تصور کر کے ان ہی کی بندگی اور اطاعت کرنے لگ جائے اور بادشاہ اور اس کی سلطنت کو بالکل بھول جائے۔

اسی طرح بہتوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کی بارش کی، ان کو ملک و مال دیا، عزت و رتبہ بخشا، تخت و تاج عنایت کیا تا کہ ان کو آزمائے کہ وہ اس کی بندگی کرتے ہیں یا اس سے بغاوت کرتے ہیں، زمین پر اس کا قانون چلاتے ہیں یا اپنا قانون چلاتے ہیں، امن و عدل پھیلاتے ہیں یا ظلم و فساد پھیلاتے ہیں، لیکن انہوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ سب کچھ ان کے استحقاق و قابلیت کا ثمرہ ہے، تکبر کیا اور بندگی کی جگہ خدائی شروع کر دی، کوئی یہ سمجھ بیٹھا کہ ہم خدا کے اوتار ہیں، جیسے مصر کے اوتار بادشاہ (GOD KINGS) اور ہندوستان کے قدیم راجے اپنے آپ کو دیوتا کی حیثیت سے اپنی رعایا سے پجواتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں میں سے اکبر کو بھی اس کے جاہل اور خوش آمدی درباریوں نے اسی قسم کے خبط میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی اپنے تئیں آسمانی مخلوق خیال کرنے لگا، مثلاً چین جاپان کے بادشاہ اپنے آپ کو بشریت سے مافوق سمجھتے تھے۔ مصر میں پہنچ کر سکندر بھی اسی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا، ان طاغوتوں کی مثال ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ اپنے کسی غلام کو کچھ خدم و حشم دے کر اپنی مملکت کے کسی علاقہ میں انتظام پر مامور کر کے اور وہ غلام خدم و حشم پا کر ایسا بدمست ہو کہ وہاں پہنچ کر اپنی بادشاہی کا علم گاڑ دے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بہتوں کو مال و متاع کی ذمہ داریوں سے سبک دوش رکھا اور مقصود اس سے انسان کے صبر و رضا کا امتحان تھا کہ دیکھے کہ یہ لوگ طمع دنیا میں پھنس کر خدا کے باغیوں ہی کو معبود بنا لیتے ہیں یا اپنے خشک نوالوں پر قانع رہ کر اپنی فطرت کے عہد پر قائم رہتے ہیں، لیکن بہتیرے اس امتحان میں پورے نہیں اترتے اور خدا کی جگہ اس کے باغیوں ہی کے تقرب کے طالب ہوئے اور ان کے لیے بندگی و نیاز مندی کی وہ ساری

رسمیں بجالائے جو رب کائنات کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہوسکتیں، ان ہی لوگوں نے خدا کے ان باغیوں کو ان کی زندگی میں خداوند نعمت اور ان داتا وغیرہ بنایا اور مرنے کے بعد ان کے مقبرے، سٹیچو اور بت تعمیر کرائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے بندوں پر روحانی برکتیں نازل کیں، بعض کو اپنا سفیر و پیغمبر بنایا، اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں نے کبھی لوگوں کو غیر اللہ کی بندگی کی دعوت نہیں دی، لیکن کچھ زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دنیا طلب مریدوں اور ان کی محبت کے جھوٹے مدعیوں نے بیشتر اپنے دنیاوی اغراض کے لیے ان کو لے جا کر خدا کی صف میں بٹھا دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور بہت سے اولیاء و مشائخ اسی طرح خدا کے شریک بنا دیے گئے۔

اسی طرح سیاسی و معاشی اغراض بھی اکثر شرک و بت پرستی کے باعث ہوئے، قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی قوموں نے دوسری قوموں کے بت محض ان کے ساتھ سیاسی تعلقات استوار رکھنے کے لیے پوجے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں کی دل جوئی کے لیے ان کے بتوں کو اپنے معبدوں میں جگہ دی، ہندوستان میں اکبر نے اسی مقصد سے بہت سی خفیف الحرکتیاں کیں، قریش نے خانہ کعبہ کو تمام قبائل عرب کے بتوں کا معبد اعظم بنا دیا تاکہ اس طرح تمام قبائل پر اپنی سیادت رکھ سکیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی بارہا اس قسم کے رذیل مقاصد کے لیے پڑوس کی مشرک قوموں کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان کے ساتھ ان کے اصنام اور ان کے مشرکانہ عقائد و رسوم بھی اپنے گھروں میں لائے اور پھر ان سے جو اولادیں پیدا ہوئیں وہ بھی لازماً شرک پر اٹھیں۔ مسلمانوں پر انگریزوں اور مغربی قوموں کے غلبہ اور ہندوؤں کے ساتھ اشتراک و ارتباط کی وجہ سے جو اثرات پڑے یا پڑ رہے ہیں ـــــ اور اگر حالات نہ بدلے تو پڑیں گے ـــــ وہ ہر واقف حال کے سامنے ہیں۔

یہ چند مثالیں طمع و رغبت کے عقبات کی بیان ہوئی ہیں، اب چند مثالیں عقبات خوف

کی بھی لیجیے۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں جو چیزیں ضرر ناک، خطرناک اور ہولناک نظر آئیں انسان نے ان کو بھی خدا کی خدائی میں شریک بنالیا۔ انسان اپنی بے اعتدالیوں، اپنی گندگیوں اور اپنی کاہلیوں کے نتیجہ میں بیماریوں میں مبتلا کیا گیا تا کہ وہ اعتدال اور پاکیزگی و مستعدی کے اس نقطۂ کمال تک ترقی کرے جو اس کے احسن تقویم میں پیدا کیے جانے کا مقتضی ہے، لیکن انسان کے نفس پر اعتدال کی پابندیاں، صفائی کی احتیاطیں اور مستعدی کی زحمتیں شاق گزریں اور یہ سارے پاپڑ بیلنے کے بجائے اس نے سہولت اس میں دیکھی کہ ان بیماریوں کے اندر روحیں مان کر ان کی دہائی دینے لگا اور ان کو نذریں اور قربانیاں پیش کرنے لگا اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کسی شخص کو کسی پتھر سے ٹھوکر لگ جائے اور وہ بجائے اس کے کہ آئندہ آنکھیں کھول کر چلنے کا عہد کرے اور جلد بازی سے احتراز کرے، ٹھوکر لگانے والے روڑے کے پاس ایک مندر بنا کے بیٹھ جائے اور اس کے سامنے ڈنڈوت شروع کر دے۔ یا ایک شخص کے کپڑے میں جوئیں پڑ جائیں اور اس کو ستانے لگیں۔ تو نہانے اور کپڑے دھونے کی زحمت اٹھانے کے بجائے وہ ان کے دفع کرنے کی یہ تدبیر کرے کہ ہر صبح اس کی جے پکارنے لگے۔

اسی طرح انسان نے دیکھا کہ سانپ ڈستے ہیں، بچھو ڈنک مارتے ہیں، شیر اور بھیڑیے پھاڑ کھاتے ہیں، ان چیزوں کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی جہاں بہت سی حکمتیں ہیں وہاں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو مدنیت، اجتماعت اور صفائی کی اعلیٰ قابلیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے محرک کا کام دیتی ہیں، یہ چیزیں انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ جنگلوں کو صاف کر کے میدان بنائے، پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے، انفرادی زندگی کو ترک کر کے مدنی و اجتماعی زندگی اختیار کرے اور اس کے اندر حفاظت و مدافعت کی جو قابلیتیں پوشیدہ ہیں ان کو فروغ کو دے۔ اگر یہ درندے اور اژدہے نہ ہوتے تو انسان خود ہی درندوں کے بھٹوں اور اژدہوں کے غاروں میں رہنے والی ایک

مخلوق بن جاتا اور مدنیت کے یہ سارے جلوے جو آج نظر آرہے ہیں، ان میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا، لیکن جن انسانوں کو یہ ساری تبدیلیاں شاق معلوم ہوئیں اور وہ جس حال میں تھے اسی میں انہوں نے پڑے رہنا چاہا، انہوں نے یہ سارے جتن کرنے کے بجائے ان کو جنگل کے دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش شروع کر دی کہ اس طرح ان کو راضی رکھ کر ان کے خطرات سے مامون رہ سکیں گے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی کاہل الوجود انسان کسی گندی جگہ میں گھر گیا ہو یا کسی دھوئیں بھرے ہوئے مکان کے اندر بند ہو گیا ہو اور اس کی قوت شامہ اور اس کے تنفس کا دباؤ اسے مجبور کر رہا ہو کہ وہ باہر کسی کھلے میدان میں اور تازہ ہوا میں نکلے، لیکن اس کی کاہلی اس سے مانع ہو رہی ہو اور وہ غلاظت کے ڈھیر یا دھوئیں کی عبادت شروع کر دے کہ اے غلاظت کی روح! اور اے دھوئیں کے دیوتا! مجھ پر ترس کھاؤ، تمہاری دہائی ہے!

اسی طرح قدرت نے، جو ہر گوشہ میں نہایت رحم و مہربان واقع ہوئی ہے، کبھی کبھی اپنے عدل اور جبروت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے زمین کو ہلا دیا، کبھی پہاڑوں سے آگ برسا دی، کبھی ہواؤں کو طوفان بنا دیا، کبھی آسمان سے بجلیاں گرا دیں تا کہ انسان خدا کی رحمت کے غرہ میں اس کے عدل کو بھول نہ بیٹھے، بلکہ اس کے قہر و غضب کو بھی یاد رکھے کہ اگر اس میں طغیان پیدا ہو تو خدا ان ہی چیزوں میں سے، جو اس کی نفع رسانی کے لیے ہر وقت سرگرم کار ہیں، جس چیز کو چاہے گا اس کے لیے سرکش بنا دے گا، لیکن انسان بجائے اس کے کہ ان تازیانوں کے ڈر سے خدا کی طرف بھاگتا وہ ان تازیانوں ہی کی طرف بھاگا اور جس طرح اس نے نعمتوں کو منعم کی حیثیت دے دی تھی اسی طرح اس نے نعمتوں کے ان ذرائع کو منتقم کا درجہ دے دیا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ جس نے اپنی رعیت کو ہر طرح کا امن و چین دے رکھا ہو کبھی کبھی اپنی فوجی قوتوں کا مظاہرہ کرے کہ رعایا یاد رکھے کہ جس بادشاہ کے پاس امن و راحت کے یہ سامان ہیں اس کے قبضہ قدرت میں تادیب و تعذیب کی یہ قوتیں بھی ہیں، لیکن رعایا یہ کرے کہ ان قوتوں ہی کو بادشاہ بنا کر ان

ہی کی تعظیم و بندگی کرنے لگ جائے اور خود بادشاہ کو نظر انداز کر دے۔

اسی طریقہ پر وہ لوگ بھی معبود بن گئے جن کو ان کی سرکشی اور طغیان کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس لیے مہلت دی کہ وہ اپنی اجل مقدر کو پہنچ جائیں، نیز ان کے ذریعہ سے ان لوگوں کی جانچ ہو سکے جو کسی نوعیت سے ان کے زیر دست ہیں کہ وہ اپنی روح کے عہد پر قائم رہتے ہیں یا اپنے جسم و تن کے مفاد کے لیے ان سرکشوں ہی کے آگے جھک جاتے ہیں اور انہی کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دیتے ہیں اس زمرہ میں انسانوں کے اندر کے سرکش بھی شامل ہیں اور جنات کے اشرار بھی، دنیا کی پوری تاریخ میں ڈھیل اور آزمائش کا یہ قانون نمایاں نظر آتا ہے فرعون، قارون، ہامان، ابولہب، ابوجہل اور ان کے راستوں پر چلنے والے تمام سرکش انسان ایک صف میں ہیں اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور محمد علیہم السلام اور اللہ کے تمام صالح اور مخلص و موحد بندے اس کی دوسری صف میں ہیں، یہ کشمکش ابتدا سے جاری ہے اور قانون الٰہی کے مطابق قیامت تک جاری رہے گی۔ کتنے ہیں جو اپنی روح کے تقاضوں کو جانتے ہوئے کسی طمع یا کسی اندیشہ سے ان جباروں اور طاغوتوں ہی کی عبادت شروع کر دیتے ہیں اور انہی کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں لیکن خدا کے کتنے بندے ایسے بھی نکلتے ہیں جو کسی حال میں بھی اپنے خدا اور اپنی روح سے شرمسار نہیں ہوتے اور نہ صرف خود ہی عہد الٰہی پر قائم رہتے ہیں، بلکہ دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شر کے اس خوف نے شر پرستی کو ایک مستقل دین بنا دیا ہے اور مجوسیوں نے خیر و شر کے دو خدا قرار دے کر دونوں کی پرستش کی اور ہندوؤں نے دنیاوی سلطنتوں کے ڈھنگ پر زندگی بخشنے والے، زندگی کی حفاظت کرنے والے اور زندگی لینے والے کی ایک تثلیث قائم کر دی، ایران اور ہندوستان کو قوموں میں زمانہ قدیم سے فلسفہ کا ذوق غالب رہا ہے، اس وجہ سے انہوں نے اپنی حماقتوں پر فلسفہ کا روغن مل دیا ہے، ورنہ غور کیجیے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ ان کے اندر جو شرک پایا جاتا ہے وہ بھی انہی راستوں سے آیا ہے جن راستوں سے دنیا کی دوسری قوموں کے اندر آیا ہے تعجب ہے کہ ان قوموں پر فلسفہ کے غلبہ

کے باوجود کائنات کے اضداد کے اندر توافق کا راز واضح نہ ہوسکا، حالانکہ اس کے ہر تضاد کے اندر وہی وحدت مقصد مضمر ہے جو زوجین میں ہوتی ہے اور قرآن نے اس کو گوناگوں شکلوں میں بیان کیا ہے جس کی تفصیل ہم نے ''حقیقت توحید'' میں بیان کی ہے۔

یہ چند مثالیں محض رہنمائی کے لیے ذکر کی گئی ہیں آپ بت پرستی کی کوئی تاریخ اٹھا کر اس نقطۂ نظر سے پڑھ ڈالیے، آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ غیر اللہ کی اطاعت وعبادت، خواہ وہ مردہ خداؤں کی پوجا شکل میں ہو یا زندہ خداؤں کی بندگی کی صورت میں، نتیجہ ہے صرف انسانوں کی دناءت کا۔

اسی دناءت ہی کی ایک شکل تقلید اعمیٰ بھی ہے انسانوں کے ایک حصہ نے نہ تو کبھی خود حقیقت پر غور کیا نہ دوسرے کرنے والوں اور خدا کے بھیجے ہوئے بندوں کو دعوت پر غور کیا۔ انہوں نے باپ دادا کو جس ڈگر پر پایا اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہے، ان کو یہ کام بڑا مشکل معلوم ہوا کہ باپ دادا کے رستے سے کوئی الگ راہ نکالیں، لیکن اگر انسان جانور نہیں ہے، بلکہ ایک عاقل اور صاحب اختیار وارادہ مخلوق ہے، تو جانور بن جانا اور اپنی عقل کو معطل کر دینا اس کی دناءت ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔

دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو طریقہ آباء کے اندھے مقلد نہیں تھے، بلکہ انہوں نے روش قدیم میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کیں اور اپنے فکر ونظر کے زور سے وقت کے رجحانات کا رخ پھیر دیا، بعضوں نے اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں بھی کیں، یہاں تک کہ بعض ہمت دروں نے زہر کا پیالہ تک پی لیا، بایں ہمہ توحید کا راز ان پر نہ کھل سکا اور وہ انہی ضلالتوں میں بھٹکتے رہے جن میں ان کی پوری قوم بھٹک رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں س اکثر ایسے تھے جو بہت سے عقبات طے کرنے کے باوجود قوم پرستی کے عقبہ کو عبور نہ کر سکے اور توحید خالص تک پہنچنے کے لیے یہ شرط ہے کہ آدمی کوئی تسمہ لگا نہ چھوڑے اور یہ سعادت یا تو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے ہے یا ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ان کی پیروی کی ہمت کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف

سے اس کی توفیق پائیں۔

اوپر ہم نے شرک کا جو سبب بیان کیا ہے قرآن مجید اور قدیم صحیفوں سے اس کی تائید ہوتی ہے قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان ۳۱:۱۳) (بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے) ظلم عدل کا ضد ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی کی حق تلفی کرنا، اوپر ہم یہ بات تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ انسان پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے پس اس کے حق میں کسی کو ساجھی قرار دینا لازماً سب سے بڑے حق کو تلف کرنا ہے، اس وجہ سے یہ ظلم عظیم ہوا اور حق تلفی کا دناءت ہونا بدیہی ہے اور جس درجہ کی حق تلفی ہوگی اسی درجہ کی دناءت بھی ہوگی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قدیم صحیفوں میں مشرک کو چھنال سے تشبیہ دی گئی ہے تورات میں یہ مضمون اکثر بیان ہوتا ہے کہ خداوند خدا غیور ہے، جس طرح تم یہ نہیں پسند کرتے کہ تمہاری بیوی غیر کی بغل میں سوئے، اسی طرح وہ پسند نہیں کرتا کہ اس کا بندہ غیر کی بندگی کرے۔ قرآن مجید کی پاکیزگی بیان نے اس تشبیہ کو بعینہٖ تو نہیں اختیار کیا ہے، لیکن اس کے مفہوم کو نہایت خوبی کے ساتھ لے لیا ہے، چنانچہ بعض جگہ قرآن میں مشرک اور زانی اور مشرکہ اور زانیہ کو ایک جگہ جمع کیا ہے، مثلاً سورۂ نور میں فرمایا ہے: اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۖ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (النور ۲۴:۳) (زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور کسی زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر کوئی زانی یا مشرک، اور اہل ایمان پر یہ چیز حرام ٹھہرائی) دو چیزوں کا ایک ساتھ اجتماع بغیر کسی اشتراک کے نہیں ہوا کرتا، اس اصل کو سامنے رکھ کر آدمی جب غور کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرک اور چھنال عورت میں نہایت گہری اخلاقی مناسبت ہے، چھنال اپنے تئیں ایک مرد کے حبالہ عقد میں دیتی ہے، اس کو اپنی حرمت کا مالک بناتی ہے، اس سے نان و نفقہ اور تمام حقوق حاصل کرتی ہے ٹھیک یہی حال ایک مشرک کا ہے وہ خدا سے ربوبیت کا اقرار کرتا ہے، بلیٰ کہہ کر اس کے ساتھ اپنی بندگی کا عہد باندھتا ہے، رہتا اس کے گھر میں ہے، کھانا اس کا کھاتا ہے، پانی اس کا پیتا ہے، کپڑے اس کے دیے ہوئے پہنتا

ہے اور اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے، لیکن اس کے باوجود وہ بندگی غیر کی کرتا ہے، محبت کا دم دوسروں کے لیے بھرتا ہے، یہ اخلاقی حالت ایک زانیہ کی ہوسکتی ہے یا ایک مشرک کی روئے زمین پر یہی دو بے وفائیاں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کے لیے مثال بن سکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ مشرکوں کو قرآن نے خائن بھی کہا ہے اور خیانت عورت کی بے وفائی اور عہد شکنی کے لیے عربی زبان کا ایک مشہور لفظ ہے۔

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہو گیا کہ قرآن مجید میں کیوں بار بار یہ بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری خطاؤں کو جس کے لیے چاہے گا، معاف کر دے گا مگر شرک کو نہیں معاف فرمائے گا، ہر شخص جانتا ہے کہ ایک شریف اور غیور شوہر اپنی بیوی کی ہر غلطی معاف کر سکتا ہے، لیکن اس کی بے وفائی کو کبھی معاف نہیں کر سکتا، اگر وہ ایسا کرے تو وہ شوہر نہیں ہے، بلکہ ایک دیوث، کمینہ، لئیم اور بے غیرت جانور ہے، جب انسان کی غیرت کا یہ عالم ہے تو پھر اس کی غیرت کا تصور کون کر سکتا ہے، جس کے جمال غیرت کے ایک ادنیٰ پرتو سے یہ تمام عالم جمال عفت وحمیت سے نورانی ہوا۔ وہ اس بندہ کو کیسے معاف کر سکتا ہے جس نے غیر کی بندگی کا داغ اپنے دامن پر لیا ہے چنانچہ فرمایا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (الحشر ۵۹:۲۳)

"وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سکھ، امن بخش، معتمد، غالب، زور آور، صاحب کبریاء، اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔"

اس آیت کے اسمائے حسنیٰ میں سے خصوصیت کے ساتھ متکبر کی صفت پر غور کرنا چاہیے اور پھر اس بات کو دیکھنا چاہیے کہ اس کے ساتھ ہی کس طرح شرکاء اور ہم سروں سے اپنا پاک اور برتر ہونا بیان کیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو متکبر اور غیور ہے اور جس کے سوا کسی کے لیے بھی کبریائی زیبا نہیں ہے، اس کی غیرت و کبریائی کبھی کسی شریک کو گوارا نہیں

کر سکتی۔

زنا اور شرک کی اسی مناسبت کی وجہ سے شرک کو جگہ جگہ رجس (ناپاکی) کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور مشرکوں کو نجس بھی کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان خائنوں سے جو اس ناپاکی سے آلودہ ہیں اپنے حرم کو پاک کرنے کا حکم دیا ہے کہ خدا اپنے حرم میں بے وفاؤں کی موجودگی گوارا نہیں کر سکتا اور یہ قانون الٰہی مقرر ہے کہ جو جماعت اس نجاست میں آلودہ ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کی زد میں آجاتی ہے یہاں تک کہ جو لوگ شرک کی اصلی حقیقت سے واقف ہیں وہ پہلے سے اس قوم کی موت کا فیصلہ کر دیتے ہیں جو شرک کے جراثیم قبول کر لیتی ہے چنانچہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ کسی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کا غضب اس وقت مقدر ہو جاتا ہے جب وہ شرک کی نجاست میں آلودہ ہو جاتی ہے:

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (الاعراف ۷:۷۱)

''اس کہا: تم پر تمہارے رب کی جانب سے ناپاکی اور قہر مسلط ہو چکے ہیں، کیا تم مجھ سے کچھ فرضی ناموں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو، جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں جن کی خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری! سو تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔''

شرک سے خدا کے حقوق جس طرح تلف ہوتے ہیں یہ بالا جمال اس کا بیان تھا، اب اس پہلو پر غور کیجیے کہ شرک خود اپنے نفس پر بھی سب سے بڑا ظلم ہے، اور اس اعتبار سے بھی یہ دناءت اور رذالت ہی ہے۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عزت بخشی ہے اور اس کو جو قوتیں اور قابلیتیں عنایت کی ہیں اگر وہ دو ناتوانیوں، یعنی بچپن اور بڑھاپے کی بے چارگیوں، کے درمیان گھری ہوئی نہ ہوتیں تو اس کے لیے دعوائے فرعونی بھی ناموزوں نہ تھا، اس کی

طبیعت کی بلندی اور تمام کائنات پر اس کے شرف وفضیلت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کسی کی بندگی کرنے کے بجائے خود معبود بننے کا خواہش مند ہوتا۔ لیکن ان تمام عظمتوں کے باوجود جب وہ دیکھتا ہے کہ نہ میں خود اپنے آپ کو اس دنیا میں لایا ہوں، نہ یہاں اپنے آپ کو رکھنے ہی پر قادر ہوں اور نہ میں نے آسمان وزمین اور ان کے درمیان کسی چیز کو بنایا، نہ ایک مکھی یا بھنگے کے بنا سکنے کی بھی مجھے قوت حاصل ہے تو وہ ضعف وعجز کے تذلل اور شکر وسپاس کے خشوع کے ساتھ ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دیتا ہے اور یہ وہ اس لیے کرتا ہے کہ ایسا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے اس کے بغیر نہ اس کی عقل مطمئن ہوتی ہے، نہ اس کے دل کو چین نصیب ہوتا ہے، نہ اس کائنات کا معمہ ہی حل ہوتا ہے یہ کر چکنے کے بعد جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے اس کے دل کی ساری پریشانیاں اور عقل کی ساری الجھنیں دور ہو جاتی ہیں اور کائنات کے اسرار کو حل کرنے کے لیے اس کو وہ سرا مل جاتا ہے، جس سے ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں، اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جن کے آگے سر جھکانا ہے تو اس کا بار ثبوت اس شخص کے ذمہ ہے وہ تو یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میرے نفس کی بلندی نے یہ ایک کے آگے پست ہونا اس لیے گوارا کر لیا کہ اس کے بغیر پناہ نہیں تھی اور اس کے بارہ میں ہم اور تم دونوں متفق ہیں، باقی اس کے علاوہ جن کا تم ذکر کرتے ہو ان کی دلیل تم خود لاؤ، مجھے خواہ مخواہ بہت سے خدا بنانے کا شوق نہیں ہے میرے لیے تو ایک ہی رب ومولیٰ بس ہے، جب کوئی غلام یہ نہیں پسند کرتا کہ کئی آقاؤں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے تو میں یہ ذلت ودناءت کیوں گوارا کروں کہ بہت سے ارباب کا بندہ بنوں:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (یوسف ۱۲:۳۹)

''کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں، یا اکیلا اللہ ہی سب پر حاوی وغالب؟''

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ

هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر ۳۹:۲۹)

''اللہ تمثیل بیان کرتا ہے ایک غلام کی جس میں کئی مختلف الاغراض آقا شریک ہیں اور ایک دوسرے غلام کی جو پورے کا پورا ایک ہی آقا کی ملک ہے، کیا ان دونوں کا حال یکساں ہوگا، سزاوار شکر صرف اللہ ہے لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی۔''

لیکن جو دنی الفطرت تھے انہوں نے اپنے نفس کی کوئی قدر نہیں کی اور خدا کی خلافت کا رتبہ پا کر انہوں نے اپنے حقیر سے حقیر خادموں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا رب بنایا اور اپنے نفس کی وہ اہانت کی جس سے بڑی کوئی اہانت نہیں ہوسکتی: وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ (الحج ۲۲:۱۸) (اور جن کو خدا ذلیل کر دے تو ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا) وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (الحج ۲۲:۳۱) (اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی اور دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے) میں اسی رذالت و دنائت کی طرف اشارہ ہے۔

۲

حقیقت توحید

مقدمہ

توحید کے دلائل پر غور کرنے سے پہلے چند امور کو بطور مقدمہ سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔

قرآن کے اوّلین مخاطب

قرآن مجید کے اوّلین مخاطبوں میں سے کوئی گروہ بھی، جیسا کہ ''حقیقت شرک'' میں ہم بیان کر چکے ہیں، خدا کا منکر نہیں تھا، بنی اسماعیل تھے جو نہ صرف یہ کہ خدا کو مانتے تھے بلکہ اس کے لیے بہت سی اعلیٰ صفتوں کا بھی اقرار کرتے تھے، ان میں جو کفر تھا وہ خدا کے انکار کی بنا پر نہیں تھا بلکہ بعض ایسی باتوں کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے تھا، جن سے خدا کی اعلیٰ صفات یا ان کے لوازم کا انکار لازم آتا تھا یا ان صفات اور ان کے لوازم میں دوسروں کی حصہ داری لازم آتی تھی۔ بنی اسرائیل تھے، جو خدا اور اس کی تمام صفات حسنیٰ کے بھی قائل تھے اور ان کے لوازم اور نتائج کا بھی اقرار کرتے تھے، لیکن ساتھ ہی بعض ایسی اعتقادی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جو ان کے تسلیم کردہ عقائد سے بالکل متناقض تھیں اور جن سے یا تو کفر لازم آتا تھا یا شرک ـــــ چنانچہ قرآن مجید نے ان دو گروہوں سے ان کو منکر خدا فرض کر کے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ ان کے مسلمات کو بنیاد قرار دے کر ان کی صرف ان باتوں کی تردید فرمائی ہے جو انہوں نے ان مسلمات سے بالکل متناقض اپنے اندر جمع کر لی تھیں۔

یہ حال صرف قرآن کے ابتدائی مخاطبوں ہی کا نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ ہم نے ''حقیقت شرک'' میں بیان کیا ہے، دنیا کی قدیم قوموں میں خدا کا انکار بہت کم پایا جاتا ہے۔ ماضی کی تمام قوموں میں کسی نہ کسی نوعیت سے ایک معبود کا تصور ضرور موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے

کہ اس تصور کے ارد گرد ایسے اوہام کا حصار ہے کہ نہ تو اس سے اس کائنات کے معمہ کو حل کرنے کے لیے کوئی روشنی حاصل ہوتی نہ ایمان وعمل صالح کی بنیادیں استوار ہوتیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ خدا کا انکار، جو بداہت کا انکار ہے، صرف عہد حاضر کی پیداوار ہے اس طرح کی سوفسطائیت اگر تاریخ میں کبھی ظاہر بھی ہوئی ہے تو وہ صرف ایک چھوٹے سے حلقہ کے اندر محدود رہی ہے ایک باضابطہ دین کی حیثیت اس نے صرف اس زمانہ میں حاصل کی ہے۔

قرآن کا طرز استدلال

یہی وجہ ہے کہ قرآن اثبات الوہیت کے باب میں، ہمارے متکلمین کے طریقہ پر، اثبات باری سے اپنی بحث کا آغاز نہیں کرتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا سارا خطاب مقتضائے حال سے بعید اور کلام موثر کی خصوصیات سے محروم ہو جاتا اور وہ حکمت بالغہ، جس نے دلوں اور روحوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی، ایک خشک و بے اثر متکلمانہ جدل کی شکل اختیار کر لیتی اور کلام کا بڑا حصہ بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہو جاتا۔ بلکہ قرآن نے اپنے مخاطبوں کی ذہنیت کے اعتبار سے ان پر حجت قائم کی اور ان کی رایوں اور ان کے عقائد میں جو غلطی اور کجی تھی وہ ان کے سامنے کھول کر رکھ دی کہ یا تو وہ صحیح اور صریح حق کو قبول کر لیں اور اگر اس سے انکار کریں تو ہٹ دھرمی اور حمیت جاہلیت کے سوا ان کے لیے کوئی اور جائے پناہ باقی نہ رہ جائے۔

لیکن چونکہ الوہیت کا مسئلہ نہایت اہم ہے، یہ مرکز دین اور مبدأ ایمان ہے، جب تک یہ سرا ہاتھ نہ آ جائے اس وقت تک نہ اس کائنات کا معمہ حل ہو سکتا ہے نہ آدمی کا کوئی قدم آگے بڑھ سکتا ہے، نہ حق و باطل اور بر و اثم کے اصول قائم ہو سکتے ہیں، نیز قرآن مجید ایک، ابدی ہدایت کا صحیفہ ہے، کسی خاص قوم یا کسی خاص عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اس کو بنی نوع آدم کی تمام گمراہیوں کا قیامت تک کے لیے علاج کرنا ہے، اس وجہ سے اس نے اس باب میں ایک ایسا جامع اسلوب بیان اختیار فرمایا، جس سے ایک طرف اللہ تعالیٰ کا تمام

صفات کمال مثلاً خلق، رحمت، علم، قدرت، عدل اور حکمت وغیرہ سے متصف ہونا ثابت ہو، تاکہ ان لوگوں پر حجت پوری ہو سکے جو کسی نہ کسی نوعیت سے کسی معبود کا عقیدہ تو رکھتے ہیں لیکن اس کی حقیقی صفات کے تصور سے قاصر ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں پر بھی حجت قائم ہو سکے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے قائل نہ ہوں۔

پس قرآن میں الوہیت کا دعویٰ، مخاطب کے اعتبار سے تین مختلف شکلوں میں نمودار ہوا ہے، ایک شکل وہ ہے جو خالص منکرین کے لیے حجت ہے ان کے لیے جا بجا توحید کی تقریر ایسے جامع اسلوب میں ہوئی ہے کہ اس سے خدا کا اثبات بھی ہوتا ہے اور اس کی یکتائی بھی ثابت ہوتی ہے دوسری شکل ان لوگوں کے لیے اختیار کی گئی ہے جو خدا کو تو مانتے ہیں، لیکن اس کے صفات حسنیٰ کے تصور میں بھٹک گئے ہیں۔ ان کے سامنے خدا کے صفات حسنی سے متصف ہونے پر تقریر کی گئی ہے تیسرے وہ لوگ ہیں جو خدا کو صفات کمال سے متصف تو مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی بعض متناقض اعمال و معتقدات میں گرفتار ہیں، ان کے سامنے ان باتوں کی تردید کی گئی ہے جو انہوں نے اپنے اقرار سے بالکل مختلف، اپنے اندر جمع کر لی ہیں۔

استدلال کی مذکورہ بالا دو قسموں کے مخاطب بالعموم بنی اسماعیل ہیں، ہر چند وہ خدا کے منکر نہ تھے، لیکن خدا کی صفات کے باب میں ان کا ذہن نہایت الجھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کے سامنے توحید کی تقریر اس طرح فرمائی کہ وجود باری کے باب میں بھی ان کے ذہن کی ساری الجھنیں دور ہو جائیں۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے جو منکر و ملحد ہیں یا خدا کی صفات کے باب میں ان کے دماغ میں الجھنیں ہیں، استدلال کی تیسری قسم کے مخاطب اصلاً بنی اسرائیل ہیں جو تورات اور انجیل پر ایمان کے مدعی تھے، لیکن اپنے مسلمات کے بالکل خلاف انہوں نے بہت ساری باتیں مان رکھی تھیں ان پر جس نہج سے دلیل قائم کی گئی ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے جو خدا کی صفات اور ان کے لوازم کے باب میں کسی عملی و اعتقادی تناقض میں مبتلا ہوں، بعض مقامات میں اس طرح کے استدلال کے مخاطب

بنی اسماعیل بھی ہیں، لیکن اس کی ایک خاص حد ہے، جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

قرآنی استدلال کی اساس

اسی طرح قرآنی استدلال کی اساس اور اس کے مبدأ و ماخذ کو بھی سمجھ لینا نہایت ضروری ہے، قرآن کے دلائل یا تو مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے مستقل اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جو مخاطب کے اقرار و انکار سے بالکل بالاتر ہوتے ہیں، پھر اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں یا تو ان دلائل کا ماخذ خود انسان کے نفس کے اندر ہے یا خارج میں، پہلی قسم کو ہم دلائل انفس سے تعبیر کریں گے اور دوسری کو دلائل آفاق سے یہ سب ملا کر قرآنی استدلال کی تین قسمیں ہوئیں۔

۱۔ وہ استدلال جو مخالف کے اقرارات و اعترافات پر مبنی ہے اس کے کئی پہلو ہیں، مثلاً جو قومیں کسی الٰہ کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان تمام صفتوں اور باتوں کو مانیں جن پر یہ لفظ مشتمل ہے یا جو قومیں اللہ کی بنیادی صفتوں کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانیں جو ان صفتوں کے لوازم میں سے ہیں۔ نیز ان صفات سے ان کی تنزیہ کریں جو ان صفات کے منافی ہیں علیٰ ہذا القیاس ان صفتوں کے تسلیم کرنے سے آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کریں۔ نیز جو قومیں کوئی آسمانی صحیفہ رکھتی ہیں یا اپنے پیچھے کوئی تاریخ رکھتی ہیں یا اپنی سوسائٹی کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی اخلاقی ضابطہ رکھتی ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی صداقتوں سے، ان کے معروف مسلمات سے، اور ان کے بدیہی منطقی نتائج سے گریز نہ کریں، ایسا کرنا اپنے تسلیم کردہ مقدمہ سے فرار اور خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔

۲۔ دوسری قسم دلائل آفاق کی ہے، اس کے بھی مختلف پہلو ہیں سب سے پہلے وہ قوانین ہیں جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خدا کی اور اس کی ان تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے خدا کے لیے بیان کی ہیں پھر وہ قوانین

ہیں جو اس کائنات کے واقعات وحوادث اور قوموں کے عروج وزوال میں کارفرما نظر آتے ہیں اور جو درحقیقت انہی صفات کے مظاہر ہیں جن سے خالق کائنات متصف ہے۔

۳۔ تیسری قسم دلائل انفس کی ہے، ان کا ماخذ درحقیقت خود انسان کا نفس ہے اور اس سے ہماری مراد وہ فطری وجدان واذعان ہے جو فاطر السموت والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے اس کے بعض پہلو بالکل واضح ہیں اور ہم پر ابران کا احساس کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو غافل و بلید انسانوں کی نگاہوں سے کبھی کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن قدرت مختلف آزمائشیں بھیج بھیج کر ان پر تنبہ کرتی رہتی ہے۔

قرآن نے اپنے استدلال کے ان تینوں ماخذوں کی خود تصریح کی ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ؕ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝ (حم السجدہ ۴۱: ۵۳-۵۴)

''ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے۔ اور کیا تیرے رب کا ہر بات کا شاہد ہونا کافی نہیں ہے! آگاہ کہ یہ لوگ اپنے رب کے حضور پیشی کے باب میں شک میں ہیں! آگاہ کہ وہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے!''

ان آیات میں دعوی روز جزا اور قیامت ہے اس پر پہلے دلائل آفاق کا حوالہ دیا ہے، پھر دلائل انفس کا ذکر فرمایا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی صفات سے استدلال کیا ہے جن کا یا تو مخاطب کو اقرار ہے یا ان صفات کا اقرار ہے جن پر یہ صفتیں مبنی ہیں۔

اس سے زیادہ واضح مثال سورۂ ذاریات میں ہے:

وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ۝ فَوَ رَبِّ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (الذریت ۵۱: ۲۰-۲۳)

''اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے اندر بھی، کیا تم دیکھتے نہیں؟ اور آسمان میں تمہاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے پس آسمان و زمین کے خداوند کی قسم، یہ بات شدنی ہے جس طرح تم بول دیتے ہو۔''

یہاں بھی دعویٰ جزا و سزا کا وقوع ہے ان آیات سے اوپر اسی دعوے پر آسمان و زمین کی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے نہایت واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات کے فاطر کی پسند یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اس دنیا کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دے، اس کائنات کے سنن و قوانین اور اس کی تاریخی سرگزشتیں اور ان کے احوال و نتائج اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ بدلہ کا ایک دن ضرور آنے والا ہے جس دن بدکار اپنی برائیوں کا بدلہ پائیں گے اور نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے گا اور پھر ایک جامع بات فرمائی کہ آسمان و زمین اور تمہارے نفوس کے اندر دلیلیں موجود ہیں، یہ آفاقی و انفسی دلائل کی طرف اشارہ ہے اس کے بعد آسمان و زمین کے رب کی قسم بطور شہادت کھائی اور اصل دعویٰ پر اپنی ربوبیت سے استدلال کیا۔

یہ دو مثالیں قرآن مجید سے ہم نے محض یہ دکھانے کے لیے بیان کی ہیں کہ قرآن نے اپنے استدلال کی بنیادیں خود بیان فرما دی ہیں باقی رہی یہ بات کہ ان تینوں ماخذوں سے قرآن نے اپنے بنیادی دعاوی: توحید رسالت اور معاد پر کس کس طرح استدلال کیا ہے تو اس کی تفصیل اپنے اپنے محل میں آئے گی، یہاں ہمارا مقصود بالاجمال قرآنی استدلال کی اساسات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

بعض ضروری تنبیہات

لیکن ہمارے اس بیان سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نے جس طرح قرآن کے استدلال کو علیحدہ علیحدہ قسموں میں بانٹ دیا ہے اسی طرح قرآن میں ان کا بیان بھی الگ الگ ہے بلکہ جس طرح آپ نے دیکھا کہ مخاطب کے اعتبار سے قرآن کے طرز استدلال

اور اس کی اساس استدلال میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اسی طرح مخاطب کے اختلاف ہی کی وجہ سے اس کے بیان کی بلاغتوں کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں کہیں صرف مخاطب کے مسلمات سے حجت پیش کی گئی ہے، کہیں دلائل انفس مذکور ہوئے ہیں اور کہیں تینوں کو یک جا کر دیا گیا ہے، اسی طرح اصل دعویٰ میں بھی اشتراک وانفراد ہے، کہیں توحید پر استدلال ہے، کہیں صرف معاد پر، کہیں ان میں سے دو جمع کر دیے گئے ہیں اور کہیں تینوں کا اجتماع ہے ان میں فرق و امتیاز کرنا ایک ناقد بصیر کا کام ہے، پھر قرآن میں استدلال کا طریقہ بالکل فطری ہے اس وجہ سے جو لوگ استدلال ونظر کے صرف مصنوعی طریقوں ہی کے عادی ہیں، وہ قرآنی استدلال کی اصل قوت کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

بعض بے خبر یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی تمام بنیاد تحکم پر ہے جو بات وحی سے معلوم ہو گئی وہ حق ہے، اس کی کوئی دلیل ہو یا نہ ہو، بلاشبہ اہل ایمان کے لیے اللہ اور رسول کا فرما دینا ہی دلیل ہے، لیکن مذہب مومنوں کے اندر نہیں منکروں کے اندر آیا ہے اور ان کے لیے اللہ و رسول کا فرمانا کوئی دلیل نہیں ہو سکتا، جب تک اس فرمان کی بنیاد کسی ٹھوس عقلی و فطری حقیقت پر نہ ہو، چنانچہ قرآن نے، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، عالم انفس اور عالم آفاق کو بطور ماخذ استدلال کے استعمال کیا ہے اور ہر باب میں اپنے دعاوی کی مطابقت آفاق وانفس کے قوانین وسنن سے دکھائی ہے اور بار بار یہ بات واضح کی ہے کہ جن باتوں کی شہادت کائنات کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے اور انسانی فطرت جن حقائق پر گواہی دے رہی ہے قرآن انہی حقائق کا داعی ہے پس نہایت ضروری ہے کہ دین کے اساسی مسائل سے متعلق قرآن کے ان دلائل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تا کہ شریعت اور عالم انفس کی باہمی موافقت کے اسرار بے نقاب ہوں اور جو لوگ قرآن کی عقلیت کی طرف سے بدگمان ہیں ان کی بدگمانی رفع ہو۔

اس مقدمہ میں ان امور پر تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ جو لوگ قرآن کے اوّلین

مخاطبوں کی مختلف جماعتوں اور ان کی خصوصیات وحالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں یا قرآن کے طرز استدلال میں مخاطب کا جس قدر لحاظ کیا گیا ہے اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں، یا ان اساسات کو نہیں جانتے جن پر قرآن کا استدلال مبنی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کا سارا استدلال ظنی اور الزامی قسم کا ہے، اس کو فلسفیانہ برہانیات سے کوئی تعلق نہیں ہے مسلمانوں میں جو لوگ یونانی علوم سے متاثر ومرعوب ہوئے وہ اسی سوءظن کی وجہ سے قرآن سے محروم رہے وہ یا تو قرآن کی طرف آئے نہیں اور اگر آئے تو اس معدن کو (العیاذ باللہ) مزبلہ سمجھ کر آئے، جہاں ان کو صرف الزامی اور خطیبانہ انداز کی دلیلوں کی توقع تھی، برہانیات کے جواہر ریزوں کی امید نہیں تھی۔ قرآن کی نسبت اسی بدگمانی میں اس زمانہ کے وہ مسلمان بھی مبتلا ہیں جو جدید فلسفہ وسائنس سے مرعوب ہیں۔ ان کو عام طور پر یہ وہم ہے کہ قرآن مجید کی عقلیت صرف متوسط درجہ کے دماغوں کو اپیل کر سکتی ہے، خواص اور عقلاء کے مبلغ ادراک سے اس کا استدلال (العیاذ باللہ) فروتر ہے، ان لوگوں کی غلط فہمی کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ نہ تو قرآنی استدلال کی اساسات سے واقف ہیں اور نہ اس بات سے واقف ہیں کہ مخاطب کے اعتبار سے یہ استدلال کن گوناگوں شکلوں میں نمودار ہوا ہے، ہم اس حصہ میں چاہتے ہیں کہ توحید سے متعلق قرآنی استدلال کی وضاحت کریں تاکہ دین کی حجت واضح ہو۔

اس حصہ میں مباحث کی ترتیب

اس حصہ میں مباحث کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے

توحید کے عمومی دلائل

۱۔ دلائل آفاق

۲۔ دلائل انفس

توحید کے خصوصی دلائل

۱۔ دلائل بلحاظ مسلمات مخاطب

۲۔ پچھلے مباحث کا خلاصہ

۳۔ عقیدۂ توحید کے اثرات فرد اور جماعت پر

۴۔ عقیدۂ توحید کی اہمیت دین میں

یہ حصہ چونکہ حقیقت شرک کا تتمہ ہے اس وجہ سے اس کے مطالعہ سے پہلے اس حصہ کا مطالعہ ضروری ہے، اس حصہ کا اصلی مقصود صرف توحید کے دلائل کی توضیح ہے، بقیہ مباحث جو اس باب سے متعلق ہیں وضاحت کے ساتھ ''حقیقت شرک'' میں بیان ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں قلم سے حق نکلی ہیں ان کو دلوں میں جگہ دے اور جہاں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے اس کے اثر کو محو فرمادے۔

باب ۱

توحید کے عمومی دلائل

دلائل آفاق

یہ دنیا، جو ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، مختلف پہلوؤں سے نہ صرف ایک علۃ العلل پر، بلکہ ایک ایسے معبود حقیقی پر شاہد ہے جو تمام صفات کمال سے متصف ہے اور اس شہادت کی بنیاد ایسے امور پر ہے جن کا ہم خارج میں مشاہدہ کرتے ہیں اور جن کے بارہ میں ہماری عقل اور ہماری فطرت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ان کو کسی ایسی ذات کی طرف منسوب کریں جو ان کی مصدر ہو سکے، ان امور کو قرآن کی زبان میں آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے ہم اس باب میں بقدر ضرورت ان کی شرح کریں گے۔

۱۔ کائنات کا حسن و جمال

سب سے پہلی چیز جو ہماری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حسن و جمال ہے، جو ہر گوشہ میں جلوہ آرا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی سادہ و بے رنگ نہیں ہے آسمان سے لے کر زمین تک کوئی چپہ ایسا نہیں ہے جہاں سے انسان غافل و بے پروا گزر سکے ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے، اس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور کانوں کو کھولنے کے لیے دلفریب مناظر، بے حجاب جلوے اور شیریں نغمے موجود ہیں اور ساتھ ہی انسان کے اندر حسن کا نہایت گہرا احساس ودیعت کیا گیا ہے، اس وجہ سے جب وہ اپنے اردگرد حسن و جمال کے یہ بوقلموں جلوے دیکھتا ہے، دفعتہ اس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ یہ تصور کرنے سے بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلفریبیوں سے یہ

معمور دنیا خود بخود وجود میں آ گئی اور اگر اس پر حیوانی بلادت کا غلبہ نہیں ہوتا تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المؤمنون ۲۳:۱۴)

''پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا!''

یعنی صرف اسی بات کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کائنات کا ایک خالق (DESIGNER) ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ بہترین خالق ہے، یکسر خیر و برکت ہے، اس نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ کمال قدرت، کمال صنعت اور کمال خیر و برکت کا نمونہ ہے:

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (السجدہ ۳۲:۷)

''جس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے۔''

ظاہر ہے کہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام رنگا رنگ حسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی ممکن تھا کہ یہ زمین ہوتی لیکن اس میں یہ باغ و چمن، یہ نشیب و فراز، یہ وادی و کہسار نہ ہوتے، ممکن تھا کہ یہ فضا ہوتی لیکن اس میں نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہے نہ ہوتے۔ ممکن تھا کہ یہ آسمان ہوتا مگر یہ ستاروں کی بزم آرائیاں، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوس قزح کی رنگا رنگیاں نہ ہوتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا ان تمام جلوؤں سے معمور ہے، سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ انسان کی حسِ باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آسکتی اور وہ خالق صرف خالق ہی نہیں بلکہ کمال قدرت، کمال صنعت و حکمت اور کمال خیر و برکت کی صفات سے متصف ہے:

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶
وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ

بَهِيْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (ق ۵۰:۶-۸)

''کیا انہوں نے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کس طرح ہم نے اس کو بنایا اور اس کو سنوارا اور کہیں اس میں کوئی رخنہ نہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں اگائیں، ہر متوجہ ہونے والے بندے کی بصیرت اور یاد دہانی کے لیے!''

یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص آسمان و زمین کے ان جلووں کو دیکھے اور یوں ہی گزر جائے، اگر آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو اس دنیا کا مشاہدہ خود بخود انسان میں خدا اور اس کی صفات حسنیٰ کا یقین پیدا کرتا ہے، اسی حقیقت کی طرف سورۂ واقعہ کی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (الواقعہ ۵۶:۷۱-۷۳)

''ذرا غور کرو اس آگ پر جس کو جلاتے ہو! کیا تم نے پیدا کیا ہے اس کے درخت کو یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں! ہم نے اس کو یاد دہانی اور صحرا کے مسافروں کے لیے ایک نہایت نفع بخش چیز بنا دیا ہے۔''

آیت کا آخری حصہ خصوصیت کے ساتھ لائق توجہ ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا کی چیزیں صرف ہماری کسی مادی ضرورت ہی کو نہیں پورا کرتیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک کی تخلیق میں حسن و خوبروئی اور کمال صنعت کی ایسی نمود ہے کہ وہ آپ سے آپ ایک اعلیٰ اور برتر حقیقت پر ایمان لانے کے لیے تنبہ بھی کرتی ہیں، اور یہ تنبہ کرنا محض ان کا ضمنی مقصد نہیں ہے، بلکہ ان کا اصلی وظیفہ ہی یہی ہے، چنانچہ آیت میں ''تذکرۃ'' کا لفظ ''متاع'' کے لفظ پر مقدم ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا اصلی مقصد یاد دہانی ہے، سامان معیشت ہونا ان کا ایک مزید فائدہ ہے، جن لوگوں کی حسِ باطن بیدار ہوتی ہے ان کو اشیاء کا یہی پہلو سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے، لیکن جن کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور بطن و فرج کی

لذات کے سوا جن کے سامنے کوئی اور اعلیٰ مقصد نہیں رہ جاتا، ان کی آنکھیں خوردبینوں اور دوربینوں سے مسلح ہونے کے باوجود، اسی حقیقت کو دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں، جو فی الحقیقت ہر شے کے اندر سب سے زیادہ ابھری ہوئی ہے، چنانچہ قرآن نے ایسے لوگوں کو چوپایوں سے تشبیہ دی ہے اور ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے کان ہیں، لیکن سنتے نہیں، آنکھیں ہیں، لیکن دیکھتے نہیں، دل ہیں، لیکن سمجھتے نہیں۔

یہ رنگا رنگ جلوے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، صرف ایک علۃ العلل کی شہادت نہیں دیتے، بلکہ ایک ایسے خالق کی شہادت دیتے ہیں جو صفات جمال و کمال سے متصف ہے، کیونکہ ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ یہ دنیا بنی ہے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ جو چیز بنی ہے خوب بنی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے، حکیم ہے، قدیر ہے، علیم ہے، مہربان ہے، کریم ہے، اس نے ہمیں جیسا تیسا پیدا ہی نہیں کر دیا ہے، بلکہ بہترین ساخت پر، بہترین قویٰ اور قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین ۹۵:۴) (ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا) نیز فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۙ﴿۶﴾ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ﴿۷﴾ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (الانفطار ۸۲:۶-۸)

''اے انسان! تجھے تیرے رب کریم کے باب میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے! جس نے تیرا خاکہ بنایا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے اور تجھے بالکل موزوں کیا! جس شکل پر چاہا تجھے مشکل کر دیا۔''

اس نے پیٹ بھرنے کے لیے ہمیں صرف غلہ ہی نہیں دیا، بلکہ لطف اندوزی کے لیے پھل اور طرح طرح کے میوے بھی پیدا کیے اور مشام نوازی اور نظر بازی کے لیے پھول بھی کھلائے اور چمن بھی اگائے:

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ﴿۱۰﴾ فِیْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۙ﴿۱۱﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّیْحَانُ (الرحمٰن ۵۵:۱۰-۱۲)

''اور زمین کو اس نے بچھایا خلق کے لیے، اس میں میوے اور کھجور ہیں جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور بھس والے اناج بھی ہیں اور خوشبودار پھول بھی۔''

ظاہر ہے یہ صرف خلق نہیں، بلکہ کمال خلق اور کمال قدرت ہے، صرف بخشنا نہیں، بلکہ کرم و بخشش اور رحمت و عنایت کے ساتھ بخشنا ہے، صرف زندہ رکھنا نہیں ہے، بلکہ اس طرح پالنا ہے جو کمال ربوبیت و پروردگاری کی شان ہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزاء کے حسن و جمال کے مشاہدہ سے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن جب ہم ان اجزاء کے انفرادی وجود سے گزر کر ان سے ترکیب پائی ہوئی اس حسین وحدت یعنی اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق و مدبر ایک ہی ہے، کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے، یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک ایک سجی سجائی بزم ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سے مجموعہ کے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے جس طرح ہم ایک حسین، متناسب الاعضاء اور خوب صورت چیز کو دیکھتے ہیں تو لازماً اس سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک ہی خوش ذوق اور کارفرما ہاتھ کی کاریگری کا کرشمہ ہے، اگر اس کے مختلف اعضاء و اجزا کی تشکیل مختلف کاریگروں کے مختلف ارادوں کے ماتحت عمل میں آتی تو یہ تناسب اور یہ حسن و جمال اس میں پیدا نہ ہو سکتا، اسی طرح اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگا رنگیوں کے اندر کارفرما ہے اگر مختلف پسندیں اور مختلف ارادے اس کے اندر کارفرما ہوتے تو اولاً تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کر لیا جائے تو یہ ایک آراستہ بزم کی جگہ ایک مال گودام بلکہ کسی کباڑیے کی دکان کی شکل میں ہوتی۔ ایک حسین وحدت کی جگہ ہم اس کو نہایت بھیانک صورت میں دیکھتے، جہاں ہر چیز بے قرینہ، بے ربط اور بے جوڑ ہوتی، کیونکہ مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے ساتھ تناسب کا وجود محال ہے، قرآن نے اس حقیقت کی طرف اس کثرت کے ساتھ توجہ دلائی ہے کہ اس

کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق

دوسرا اہم اور قابل توجہ پہلو اس کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق (HARMONY) اور ان کی باہمی سازگاری ہے، اس دنیا کے مختلف اجزاء میں جو باہم ایک دوسرے سے ضدین کی نسبت رکھتے ہیں اسی طرح کی سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے جس طرح کی سازگاری اور موافقت ہم زوجین میں دیکھتے ہیں ایک عورت اپنے ظاہر و باطن میں مرد سے بالکل مختلف حالت رکھتی ہے، اسی طرح ایک مرد عورت سے بالکل مختلف خصوصیات وصفات کا حامل ہے، تاہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جیسا شدید روحانی وجسمانی اتصال رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے عورت کے پاس جو کچھ ہے وہ مرد کو نہ صرف یہ کہ مطلوب ومرغوب ہے، بلکہ اگر عورت نہ ہو تو مرد کی ہستی اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے، اسی طرح مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کے دواعی اور مقتضیات کا گویا جواب ہے، یہاں تک کہ اگر مرد کو معدوم فرض کر لیا جائے تو عورت کی خصوصیات وصفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن ہو جاتی ہے، ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے زمین وآسمان، شب وروز، گرمی وسردی، نور وظلمت، حرارت وبرودت، سب زوجین کا سا ہے اور سب انہی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عورت ومرد میں سے جس طرح ایک تنہا وجود بے غایت ہے اسی طرح ان تمام اجزائے مختلفہ میں سے ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر بالکل بے مقصد ہو جاتی ہے، کوئی چیز اپنے مقصد کو پورا ہی اس وقت کرتی ہے جب وہ اپنے جوڑے سے ملتی ہے۔

توافق کا یہ پہلو صرف ہم ضدّین ہی میں نہیں پاتے، بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق وسازگاری ہے۔ ہر چیز اپنی ہستی کے بقا اور اپنے وجود کی نشو ونما کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لیے

سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آکر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش ونگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں، زمین اس کے لیے گہوارہ مہیا کرے، ابر اس کے لیے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرم رکھے، شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے، ہوائیں اس کو لوریاں دیں، جب یہ سب کچھ ایک خاص ضبط ونظم کے ساتھ ہولے تب کہیں جا کر گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے اور یہی حال اس دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کائنات کا ارتقاء آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے ایک مدبر ہستی (MIND) ہے جو ان تمام اجزائے مختلفہ کے اندر توافق وسازگاری پیدا کرتی ہے اور ان کو پروان چڑھاتی ہے؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی واقعہ (ACCIDENT) ہے، آپ سے آپ وجود میں آگئی اور اس کے مختلف اجزاء کا ارتقاء بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے، تو کیا اس کے اجزائے مختلفہ کے اندر توافق وسازگاری کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاقی ہے؟ کیا کوئی عاقل ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ، مٹی، دریا، پہاڑ، سورج، چاند، چرند و پرند سب اتفاقی حوادث کے طور پر ظہور میں آئے، ہر ایک کا بطور خود ارتقاء ہوا، پھر بالکل اتفاق سے ان میں یہ حیرت انگیز توافق پیدا ہو گیا اور پھر بالکل اتفاق ہی ہے یہ سب انسان کے لیے نہ صرف سازگار، بلکہ اس کے خدمت گزار بن گئے؟ کیا عقل انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم کر سکتی ہے۔

یہ صورت حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم وقوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور جو علم وقدرت اور ربوبیت وحکمت کی تمام صفات سے متصف ہے، وہی ہے جو اپنے علم وحکمت سے اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط واتصال پیدا کرتا اور ان کو صالح مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی بھی شہادت مل رہی ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک اور زمین وآسمان کے درمیان صرف ایک ہی

ہے جو مالک و متصرف ہے کوئی دوسرا ارادہ اس کا شریک و سہیم نہیں ہے، اگر زمین و آسمان کے الگ الگ ناظم و مدبر ہوتے یا بہت سے ارادوں کی کارفرمائی ہوتی یا خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خدا ہوتے تو کائنات کے ان مختلف اجزاء میں یہ زوجین کا سا توافق اور ربط نہ ہوتا جو ہم اس دنیا کے ہر گوشہ میں مشاہدہ کر رہے ہیں، قرآن نے اس دلیل کو مختلف مقامات میں بیان فرمایا ہے ہم بطور مثال صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

یہ دلیل نہایت اختصار کے ساتھ سورۂ ذاریات میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَ لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (الذاریت ۵۱:۴۹-۵۱)

''اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تا کہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔ پس اللہ کی طرف بھاگو، میں اس کی طرف سے تمہارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ بناؤ۔ میں اس کی جانب سے تمہارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔''

یہاں ہر چیز کو جوڑے جوڑے ہونے سے معاد اور توحید دونوں پر استدلال کیا ہے، معاد پر استدلال یہاں زیر بحث نہیں ہے، اس کی تفصیل ان شاء اللہ ہماری کتاب ''حقیقت معاد'' میں آئے گی، توحید پر استدلال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں پیدا ہوئی ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی اپنی غایت پوری کرتی ہے یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا وجود و بقا اس کے اضداد کے توافق و سازگاری سے ہے اور اس سے بدیہی طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا خالق و مدبر ایک ہی ہے جو ان کے اختلافات کے باوجود ان میں ربط و اتصال پیدا کر کے ان سے صالح نتائج پیدا کرتا ہے۔ پس یہ اختلاف جو ہم اس کائنات میں مشاہدہ کر رہے ہیں، محض ظاہر کا اختلاف ہے

اور ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں، ان اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اس امر کی نہایت کھلی ہوئی شہادت ہے کہ صرف ایک ہی ہے جس کے تصرف کے تحت اس کائنات کے تمام اجزا اپنے اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں، اس دلیل کی تفصیل سورۂ بقرہ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۲:۲۱-۲۲)

''اے لوگو، بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔ اس کی بندگی کرو جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمہاری روزی کے لیے تو تم اللہ کے ہم سر نہ ٹھہراؤ، درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔''

یعنی جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے، پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے اور وہ پھل انسان کے لیے لذت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں، وہ انسان کیسے تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں، بارش کوئی لاتا ہے اور پھل کوئی پیدا کرتا ہے ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبر قوت، حکمت و رحمت کے ساتھ، ایک خاص مقصد کے لیے، تصرف میں لائے۔ یہی دلیل ذرا اور پھیلاؤ کے ساتھ دوسری جگہ بیان ہوئی ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (البقرہ ۲:۱۶۳-۱۶۴)

''اور تمہارا ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان اور رحیم ہے، بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جان دار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

سورۂ نحل میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کائنات کی ہم آہنگی کو واضح فرمایا:

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (النحل ۱۶:۶۵-۶۹)

''اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا پس اس سے زمین کو زندہ کر دیا اس کے خشک ہو جانے کے بعد، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا سبق ہے، ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں، پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار اور

کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی، تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی، بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں، اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر القا کیا کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو چھتیں اٹھاتے ہیں ان میں چھتے بنا، پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس، پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل، اس کے پیٹ سے مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔''

ان آیات میں اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارات ہیں، بادلوں سے پانی برستا ہے اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے، اسکی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں، اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ الآئشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لیے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے پھر اسی بارش کے پرورش کیے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر لیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر، درختوں کی شاخوں پر، انگور کی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنا لیتی ہیں، پھول پھول کا رس چوس کر ان کو جمع کرتی ہیں، جن کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف انسان ان کو پیتا ہے ان سے لذت بھی حاصل کر لیتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی، ان مناظر کو جو شخص بھی دیدۂ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کر سکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مظاہر بالکل ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آ گئے ہیں یا یہ کہ یہ آسمان و زمین اور ان کے مختلف جلوے مختلف دیوتاؤں کی کارفرمائیوں کے کرشمے ہیں۔ جس دنیا کے اتنے بعید اجزاء کے اندر اتنے گہرے رشتے ہیں اور جو کائنات اپنے متضاد اجزاء کی کشاکشوں کے اندر توافق و سازگاری کے اتنے پہلو رکھتی ہے وہ نہ تو ایک اتفاقی واقعہ ہو سکتی، نہ مختلف ارادوں کی رزم گاہ ہو سکتی، ظاہر بین نگاہیں صرف موجوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں، موجوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش پانے والے گہر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی اور یہی وہ حقیقت ہے

جس کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو، بلکہ ان صالح نتائج کو دیکھو جو ان کے اضداد کی کشاکش کے اندر پیدا ہو رہے ہیں اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے:

وَ مَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۚ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَ مِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۚ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ (فاطر ۳۵: ۱۲-۱۳)

''اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں ایک شریں، پیاس بجھانے والا، پینے کے لیے خوش گوار ہے اور ایک کھاری کڑوا ہے اور تم دونوں سے تازہ گوشت کھاتے اور زینت کی چیز نکالتے ہو جس کو پہنتے ہو اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو اس میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو، اور تاکہ تم شکر گزار بنو، وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے ہر ایک گردش کرتا ہے، ایک معین وقت کے لیے وہی اللہ تمہارا رب ہے، اسی کی بادشاہی ہے۔''

کھاری پانی کے ایک سمندر اور شریں پانی کے ایک دریا میں کتنا کھلا ہوا تضاد ہے، تاہم دیکھو، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے لیے غذا کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے، کس طرح ان دونوں سے اپنی زینت و آرائش کے لیے موتی حاصل کر لیتا ہے، پھر کس طرح یہ جہاز رانی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرتے ہیں، پھر شب کی ظلمت اور دن کے نور پر غور کرو، دونوں اپنی صفات و خصوصیات میں کس قدر ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، پوری ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ، ایک دایہ کی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بسنے والے حیوانوں، انسانوں اور نباتات کی خدمت

میں سرگرم ہیں سورج دن میں طلوع ہوتا ہے، اور گرمی اور دھوپ کا سرچشمہ ہے، چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خنکی کا منبع ہے۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں، لیکن دیکھتے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک وجود ان سے متمتع ہو رہا ہے اور یہ انسان کو بالواسطہ اور بلاواسطہ فیض رسانی پر مامور ہیں، کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے؟ ان مشاہدات کے باوجود جو لوگ دنیا کے اتفاقی حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا یہ اصرار محض نہ ماننے کی خواہش پر مبنی ہے، علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے۔

۳۔ ضد سے ضد کا وجود

اسی طرح ایک اور پہلو پر غور کرو، اس کائنات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ضد سے ضد کا وجود ہوتا ہے سرسبز و شاداب درخت سے چنگاریاں جھڑتی ہیں

جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا (یٰس ۳۶:۸۰)

''تمہارے لیے سرسبز درخت سے آگ پیدا کردی۔''

موت سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور زندگی سے موت:

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (الانعام ۶:۹۵)

''وہ برآمد کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہی برآمد کرنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، سو وہی اللہ ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔''

ظاہر ہے کہ علت و معلول کے عام قانون سے یہ شے بالاتر ہے اور پیدائش کا وہ معروف ضابطہ جس پر ہم کو اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کی ادنیٰ خلاف ورزی کا بھی ہم تصور نہیں کر سکتے، یہاں آکر بالکل ٹوٹ جاتا ہے کیا یہ اس امر کا نہایت واضح ثبوت نہیں ہے کہ کوئی ہستی ان تمام ضوابط سے بالاتر بھی ہے جو ان سب پر اپنی قدرت کاملہ سے تصرف کرتی

رہتی ہے اور اضداد سے اضداد کو وجود میں لاتی ہے اور ان کو اپنی مخلوقات کے لیے نافع بناتی ہے؟ جو لوگ اس کائنات کو محض علت و معلول کے اندھے بہرے قواعد کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسی روشنی میں اس کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں وہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے پیدا ہونے کی توجیہ کریں گے اور ہرے بھرے درخت سے تروتازہ پھلوں کی جگہ آگ کے شرارے جھڑنے کی کیا تعلیل کریں گے؟ کیا علت و معلول کا عام ضابطہ یہی چاہتا ہے کہ ضد سے ضد پیدا ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے لازماً ایک ہستی کا اقرار کرنا پڑتا ہے جو ان تمام سنن طبعی پر حاکم و متصرف ہے۔

۴۔ متحدات سے مختلفات کا وجود

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک اور حقیقت بھی ہے، ہم اس کائنات میں دیکھتے ہیں کہ متحدات سے مختلفات کا وجود ہوتا ہے، سائنس کا دعویٰ ہے کہ یہ کائنات اپنے آغاز میں بسیط ہے، پھر درجہ بدرجہ اس کے اجزاء میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑھتا جاتا ہے، یہ اگر سچ ہے اور اس کی سچائی سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کوئی تفریق و تقسیم کرنے والا ہے جو ایک کو دو اور دو کو چار کرتا ہے اور یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ مظاہر کا تنوع اللہ کے تعدد اور تنوع کی دلیل نہیں ہے زمین ایک ہی ہے، ہوائیں بھی ایک ہی طرح کی چلتی ہیں، تاہم نباتات بے شمار قسم کی اگتی ہیں پھولوں کے رنگ قسم قسم کے ہوتے ہیں، پھلوں کی شکل و صورت، ان کی مقدار، ان کے رنگ و بو، ہر چیز کے اندر تفاوت ہوتا ہے، ایک ہی گٹھلی سے کبھی ایک سے زاید انکھوے نکلتے ہیں اور ان سے متعدد تنے اور شاخیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور کبھی ایک ہی انکھوا نکلتا ہے اور ایک ہی تنا پیدا ہوتا ہے۔

وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (الرعد ۱۳:۴)

''اور زمین میں پاس پاس کے قطعے ہیں، انگوروں کے باغ ہیں، کھیتی ہے اور کھجور ہیں، جڑواں بھی ہیں اور اکہرے بھی، سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں لیکن ہم پیداوار میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتے ہیں بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

یعنی جس شخص میں عقل ہوگی لازماً اس سے اس کو تنبہ ہوگا اور وہ ہر چیز کے رنگ اور اس کے پھلوں اور پھولوں کے تنوعات پر غور کرے گا تو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کوئی خالق ہے جو کمال حکمت وقدرت اور کمال رحمت کے ساتھ تصرف فرما رہا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس پر واضح ہوگی کہ وہ اکیلا اور لاشریک لہٗ ہے کیونکہ جب ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پودے اور ایک ہی قطعۂ زمین کے درختوں سے یہ سارے تنوعات ہم دیکھتے ہیں اور اس کو پانی اور زمین کے اختلاف کا نتیجہ نہیں قرار دیتے تو اس کائنات کی اس گوناگونی کو آلہہ کے تعدد کی دلیل کیوں ٹھہرائیں؟ نیز یہ بات بھی اس پر واضح ہوگی کہ یہ سارے تنوعات پیدائش کے کسی اندھے بہرے ضابطہ کے کرشمے نہیں ہیں بلکہ کوئی علیم وقدیر ہستی ہے جو ہر چیز کو اپنے اندازہ کے ساتھ وجود میں لاتی ہے اور اپنی حکمت کے مطابق اس میں کمی بیشی کرتی رہتی ہے۔

۵۔ مظاہر کائنات کی تسخیر

توحید کی ایک بہت بڑی دلیل وہ عجز ومقہوریت اور انقیاد واطاعت بھی ہے جس کے آثار ہم اس کائنات کی تمام بڑی اور شاندار مخلوقات میں پاتے ہیں، یہ اس بات کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی طرف بھی الوہیت کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔ الوہیت کی صفت کے ساتھ کوئی ایسی ہی ذات متصف ہے جو ان سب سے اعلیٰ اور ان سب سے برتر ہے، سورج، چاند، ستارے، اپنے حسن وعظمت کے باوجود، اور زمین، دریا، پہاڑ، ہوا، ابر، برق ورعد، اپنی وسعت، قوت اور جلالت کے علی الرغم ایک محکم نظام حکمت کے

ماتحت مقہور و مسخر ہیں تو لازماً ان کے سوا کوئی اور ہے جو ان سب کا خالق اور سب پر فرمانروا ہے، اب غور کرو وہ کون ہے جو ان سب کا خالق اور سب پر آمر و متصرف ہے؟ اس سوال کو قرآن نے بار بار اٹھایا ہے اور اس کا جواب مشرک عربوں کی زبان سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ اس عالم کا خالق ایک عزیز و حکیم ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ

(الزخرف ۹:۴۳)

''اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ لازماً یہی جواب دیں گے کہ ان کو خدائے عزیز و علیم نے پیدا کیا ہے۔''

کیونکہ جو شخص اس کائنات کے مظاہر پر غور کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان میں سے کسی کی طرف اس کائنات کی تخلیق کی نسبت نہیں کی جا سکتی، اس کائنات کی خالق کوئی ایسی ہی ذات ہو سکتی ہے جو عزت و کبریائی اور علم و حکمت کی تمام صفات کے ساتھ متصف ہو۔

یہاں اس امر کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان مظاہر میں سے جو جتنے ہی زیادہ شاندار ہیں ان کی پیشانی پر اطاعت کا داغ اسی قدر زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے دنیا نے سورج اور چاند کی سب سے زیادہ پرستش کی ہے، حالانکہ ذلت و اطاعت، سجود و ہبوط اور کسوف و خسوف کے آثار جو ہم ان میں دیکھتے ہیں، دوسری کسی چیز میں نہیں دیکھتے، لیکن یہ انسان کی عجیب حماقت ہے کہ ان آثار کے مشاہدہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی بلکہ اس نے ان کی ذلت کی ان علامتوں کو بھی ان کی الوہیت کے دلائل میں سے گن لیا۔

توحید کی یہ دلیل، اجمال و تفصیل کی مختلف شکلوں میں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے، ہم صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حجت کو یہاں نقل کرتے ہیں، جو انہوں نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ابراہیمی حسن مجادلہ کی بہترین تصویر ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الانعام ۶:۷۶-۷۹)

''پس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو ڈھانک لیا اس نے ایک تارے کو دیکھا، بولا کہ یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ ڈوب گیا اس نے کہا: میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا، پھر جب اس نے چاند کو چمکتے دیکھا، بولا: یہ میرا رب ہے پھر جب وہ بھی ڈوب گیا، اس نے کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا، پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا بولا کہ یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو، میں نے تو اپنا رخ بالکل یک سو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

۶۔ کائنات کی محکم تدبیر

اسی طرح خدا کے وجود اور اس کی توحید کی ایک بہت بڑی شہادت وہ محکم اور ہمہ گیر تدبیر و نظام ہے جس کا، اس کائنات کے ہر گوشہ میں، ہم مشاہدہ کرتے ہیں، ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا مختلف قوتوں کی ایک رزم گاہ ہے، دوسری طرف یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان قوائے مختلفہ کے اس تصادم کے اندر نہ صرف یہ کہ تمام چھوٹی بڑی مخلوقات قائم و باقی ہیں، بلکہ اپنی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے پھل پھول رہی ہیں، ایک طرف یہ حال ہے، کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی ہر قوت شتر بے مہار کی طرح اپنے رخ پر بڑھتی چلی جا رہی ہے، نہ وہ کسی نظام قاہر کی پابند معلوم ہوتی نہ کسی برتر قوت کی محکوم و مطیع، لیکن پھر دفعتہً

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی مخفی ہاتھ اس کی باگ موڑ کر اس کو ایک سمت سے دوسری سمت پر لگا دیتا ہے، کتنی بار ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض بڑے بڑے اجرام سماویہ کسی خاص رخ پر بڑھ چلے اور اگر وہ اسی رخ پر بڑھتے چلے جاتے تو لازم تھا کہ ہمارے کرۂ زمین سے ٹکرا جاتے اور یہ کرۂ زمین پاش پاش ہو کے رہ جاتا، چنانچہ اس طرح کے مشاہدات کی بنا پر کبھی کبھی ماہرین فلکیات نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ فلاں مدت کے اندر یہ زمین فلاں جرم سماوی سے ٹکرا جائے گی، لیکن جب وہ متعین وقت آیا، دفعتہً اس جرم نے اپنا رخ اس طرح بدل دیا گویا کسی سوار نے مرکب کی باگ موڑ دی اور وہ عظیم خطرہ جو ہماری اس دنیا کے بالکل سر پر آ گیا تھا یکا یک دفع ہو گیا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غور کرو، یہ راکب کون ہے؟ کون ہے جو قویٰ اور عناصر اور اجرام و اجسام کی باگیں تھامے ہوئے ہے؟ جس حد تک چاہتا ہے ان کو ڈھیلتا ہے اور پھر جہاں چاہتا ہے روک لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک انچ بھی بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے، کیا یہ محض اتفاق ہے؟ کیا یہ اندھی بہری قوتوں کی اپنی صواب دید سے سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا عقل بشری اور قلب انسانی کو ان جوابات سے تشفی و طمانیت مل سکتی ہے؟ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (فاطر ۳۵:۴۱)

"اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں، اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے بعد کوئی اور ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک وہ نہایت حلیم و غفور ہے۔"

اور کون ہے جو اس جواب کی سچائی کا انکار کر سکتا ہے؟

یہ وہ تدبیر و نظام ہے جو اس مادی دنیا کے قویٰ اور عناصر کے درمیان ہم دیکھتے ہیں، اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم اس کائنات کے اخلاقی قویٰ کے تصادم اور اس کے احوال و نتائج پر

غور کریں تو وہاں بھی ہمیں یہی قانون کارفرما نظر آتا ہے، ایک باطل نظریہ جنم لیتا ہے، اس نظریہ کے علم بردار پیدا ہوتے ہیں، اس پر ایک باطل نظام اخلاق، ایک باطل نظام معیشت اور ایک باطل نظام سیاست کے ردّے چڑھتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس غلبہ کے نیچے دب کر صالح اخلاق کے تمام عناصر دم توڑ دیں گے، تاہم اس نظام باطل کو مہلت ملتی رہتی ہے، یہاں تک کہ تمام خشکی و تری میں فساد کی سیاہی چھا جاتی ہے اور اس عالم کے مصلحین اس دنیا کی از سر نو اصلاح سے مایوس ہونے لگتے ہیں، پھر دفعتہً ایک وقت آتا ہے کہ کوئی مخفی ہاتھ نمودار ہو کر اس پورے نظام باطل کو اس طرح جھنجوڑ دیتا ہے کہ اس کی ایک ایک اینٹ بکھر جاتی ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا

(یوسف ۱۲:۱۱۰)

''یہاں تک کہ جب یہ نوبت آ گئی کہ رسول اپنی قوموں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ ان کو جھوٹ ڈراوے سنائے گئے تو ان کو ہماری مدد آ پہنچی۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (البقرہ ۲:۲۱۴)

''اور وہ اس قدر جھنجوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی! بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے!''

ان مشاہدات کے بعد کون ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکے کہ یہ دنیا آپ سے آپ وجود میں آئی اور خود بخود قائم ہے؟ یا یہ گمان کر سکے کہ یہ مختلف قویٰ اور عناصر کی ایک رزم گاہ ہے اور یہ قویٰ اور عناصر کسی بالاتر طاقت کے زیر نگیں نہیں ہیں؟ یا یہ خیال کر سکے کہ اس بالاتر قوت کی حاکمیت منقسم ہے؟ یا یہ سوچ سکے کہ اس دنیا کو اس کے پیدا کرنیوالے نے پیدا کر کے اندھے بھینسے کی طرح چھوڑ دیا ہے، اس کے اوپر کوئی بالاتر اخلاقی اصول کارفرما

نہیں ہے؟

۷۔ ہر نظم اجتماعی کے لیے لازم ہے کہ حاکمیّت غیر منقسم ہو

اس عالم کا مجرد قیام ہی اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا حاکم ایک ہے جس کی حاکمیت غیر منقسم ہے ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی سیاسی تنظیم کا تصور اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک حاکمیّت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کریں، حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی محکم تنظیم اجتماعی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، تمام سیاسی تنظیمات میں جمہوریت وہ نظام ہے جس نے حاکمیّت کو ایک وسیع دائرہ میں پھیلانے کی کوشش کی ہے تاہم اس میں بھی ایک ایسا نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی پھیلی ہوئی حاکمیت سمٹتی اور مجتمع ہوتی ہے، اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نراج اور انارکی کے طوفان میں منتشر ہو جانا لازمی ہے بہر حال یہ امر بالکل قطعی ہے کہ حاکمیّت کی تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اب غور کرو کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزاء پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پوری قوت و استحکام کے ساتھ قائم ہے اس میں مختلف قویٰ کا تصادم بھی ہے، اضداد کی آویزشیں بھی ہیں، خیر و شر کے معرکے بھی ہیں، لیکن اس دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے بچتی، سنبھلتی، اچھلتی اور کتراتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور اس خوبی اور صفائی کے ساتھ کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس صورت حال کا مشاہدہ ہم میں سے ہر وہ شخص کر رہا ہے جو اس پادشاہی کے نظام پر غور کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون سی بات عقل سے قریب تر ہے کیا مشرکین کا یہ عقیدہ کہ آسمان و زمین کے معبود الگ الگ ہیں، یا یہ حقیقت کہ ایک ہی ہے جو آسمانوں کا بھی خدا ہے اور زمین کا بھی؟ کیا اس کائنات سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ نور و ظلمت کے الگ الگ الٰہ ہیں، یا اس بات کی کہ روشنی اور تاریکی دونوں کا نکالنے والا ایک ہی ہے؟ کیا یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ دنیا بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے، یا یہ بات نظر آتی ہے کہ اس سارے نظام کا ناظم و مدبر صرف اللہ واحد و قہار ہے؟ اگر پہلی بات

صحیح ہے تو یہ شیرازہ بکھر کیوں نہیں جاتا، یہ نظام درہم برہم کیوں نہیں ہو جاتا؟ عرش والے کے خلاف بغاوت کیوں نہیں پھوٹ پڑتی؟ حاکمیت کے ایسے تشتت وانتشار کے ساتھ یہ وحدت قائم کیونکر ہے؟ یہی حقیقت ہے جو قرآن کریم نے عربوں کے سامنے اور ان تمام مشرک قوموں کے سامنے پیش کی ہے جو اس کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت سے حاکمیت کے انقسام کو تسلیم کرتی ہیں:

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (الانبیاء ۲۱:۲۱-۲۲)

''کیا انہوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لیے ہیں وہ زمین کو شاداب کرتے ہیں؟ اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کر رہ جاتے تو اللہ، عرش کا مالک ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۴۲-۴۳)

''کہہ دو کہ اگر کچھ اور الٰہ بھی اس کے شریک ہوتے، جیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی کر دیتے، پاک اور بہت برتر ہے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔''

۸۔ حق و باطل کی آویزش اور حق کا غلبہ

بعض قوموں کو خدا کی توحید، بلکہ خود خدا کے باب میں بڑا سخت مغالطہ، دنیا میں شر و باطل کے وجود سے، پیش آیا ہے، ان کی نظر باطل کے جھاگ پر جم گئی اور اس جھاگ کے نیچے جو حق کا مکھن تھا وہ ان کو نظر نہ آ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یا تو سرے سے کسی عزیز و رحیم اور پاک و قدوس خدا کے وجود ہی سے منکر ہو گئیں، یا مانا تو یہ مانا کہ یہ دنیا بہت سے خون آشام دیوتاؤں کی لیلا ہے اور وہ اس کو پیدا کر کے، دور بیٹھے ہوئے،

اس کے مصائب وشدائد اور اس کے دکھوں اور آفتوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں، یا پھر یہ کیا کہ خیر وشر اور نور وظلمت کے الگ الگ خدا ٹھہرا لیے اور دنیا کو ان متضاد قوتوں کی ایک رزم گاہ بنا دیا، یہ غلط فہمی قوموں کو محض قلت تدبر، قلت صبر اور ظاہر بینی کی وجہ سے ہوتی۔ نہ انہوں نے اس دنیا کے اصلی مزاج وقوام کو پہچانا اور نہ حق و باطل کی اس آویزش کے اندر حق کے غلبہ کا مشاہدہ کیا۔ قرآن نے ان تمام اوہام کی نہایت تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے ہم اجمال کے ساتھ بعض حقائق کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں قرآن نے اس دنیا کے اصلی مزاج کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (الرعد ۱۳:۱۷)

''اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلیں، پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھالیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں کے اندر سے بھی ابھرتا ہے جن کو یہ زیور یا اسی قسم کی کوئی اور چیز بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ تو بے مصرف ہو کر اڑ جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہوتی ہے وہ زمین میں ٹک جاتی ہے اسی طرح اللہ تمثیلیں بیان کرتا ہے۔''

یعنی اس دنیا کا اصلی مزاج یہ ہے کہ جس طرح ایک خوش مذاق اور سلیم الفطرت انسان مکھی کو نہیں ہضم کر سکتا اسی طرح یہ باطل کو ہضم نہیں کر سکتی۔ یہ ہر گوشہ میں باطل کو چھانٹتی رہتی ہے اور حق و نافع کو قبول کرتی ہے بارش ہوتی ہے اور وادیاں بہہ نکلتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ پانی کی سطح پر جھاگ ابھر آتے ہیں، پھر پانی زمین میں ٹک جاتا ہے اور جھاگ خشک ہو کر ہوا میں اڑ جاتا ہے اسی طرح تم چاندی کو زیور بنانے کے لیے کٹھالی میں پگھلاتے ہو، اس کا میل الگ ہو جاتا ہے اور خالص چاندی بچ رہتی ہے یہی اس دنیا کا اصل مزاج ہے اس

میں مجرد باطل کا وجود نہیں ہے باطل جب بھی پایا جاتا ہے حق کے ساتھ مخلوط ہو کر۔ جس طرح صالح درختوں اور صالح جانداروں کے ساتھ طفیلی پودے اور طفیلی کیڑے چمٹ جاتے ہیں، اسی طرح حق کے ساتھ باطل چمٹ جاتا ہے، تم تنگ نظری کی وجہ سے ان طفیلی کیڑوں اور طفیلی پودوں ہی کو اصل سمجھنے لگتے ہو اور پھر قدرت کی زیادتیوں اور بے حکمتیوں پر معترض ہوتے ہو حالانکہ یہ اعتراض محض تمہاری بوالفضولی اور حماقت کا نتیجہ ہے قدرت ہر گوشہ میں نہایت حکیم اور حق دوست ہے، اگر کسی مصنوع سے صانع کے مذاق وطبیعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے تو اس دنیا کے اس مزاج کو دیکھ کر نہایت آسانی سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق حق ہے، حق کو پسند کرتا ہے اور اپنے کلمات سے حق کو قائم وثابت کرتا ہے یہی حقیقت ہے جو ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے،

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَ لَكُمُ الْوَیْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ

(الانبیاء ۲۱:۱۶-۱۸)

''اور ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشا کے طور پر نہیں بنایا ہے، اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو خاص اپنے پاس ہی بنا لیتے، اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے! بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ اس کا بھیجا ہی نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کے رہے گا اور تمہارے لیے اس چیز کے سبب سے جو تم بیان کرتے ہو، بڑی خرابی ہے!''

اس دنیا کے اندر جو مصائب وآلام ہیں وہ بھی اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ یہ دنیا مختلف المزاج دیوتاؤں کی رزم گاہ ہے، قرآن نے تمام آسائشوں اور تمام دکھوں کو ایک ہی حکیم وقدیر خدا کی مشیت وحکمت کے تحت، اور ان قوموں کے اخلاق واعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ یہ سمجھایا ہے کہ بعض مرتبہ یہ آفتیں اس لیے آتی ہیں کہ جو

مغرور اپنی سرکشی میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں وہ ان سے متنبہ ہوں اور اپنے ضعف و عجز کو محسوس کر کے خدا کی طرف لوٹیں، بعض مرتبہ ان کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ سرکش قوم، جس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو چکی ہے، ان کے ذریعہ سے تباہ کر دی جائے، بعض حالات میں اہل حق بھی ان میں سے کچھ حصہ پاتے ہیں تا کہ ان کے ایمان وعقیدہ اور صبر وعزیمت کا امتحان ہو، کمزوریاں دور ہوں اور خوبیاں اور قابلیتیں بروئے کار آئیں۔ ان ساری باتوں کو قرآن حکیم نے مختلف اسلوبوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس طرح رات اور دن، سردی اور گرمی دونوں اس دنیا کے مادی بقا کے لیے یکساں ضروری ہیں اسی طرح نعمتوں اور خوش حالیوں کے ساتھ ساتھ آفات وآلام بھی اس دنیا کی اخلاقی زندگی اور روحانی حیات کے لیے ناگزیر ہیں اور یہ ہرگز اس امر کا ثبوت نہیں ہیں کہ اس دنیا میں کون وفساد اور رحمت وقہمت کے الگ الگ دیوتا ہیں بلکہ صرف ایک ہی ہے جو منعم بھی ہے اور وہی منتقم بھی ہے اور اس کا یہ انتقام بھی درحقیقت اس کے انعام ہی کا ایک پہلو ہے، جیسا کہ قرآن میں اس امر کو واضح فرمایا ہے۔

یہی حال گناہوں اور معاصی کا ہے یہ بھی خدا کی مشیت کے تحت ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت، جو انسان پر ہوئی ہے، یعنی اختیار، یہ اس کے ظلال میں سے ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بدی کی پہچان دے کر اس کا امتحان کیا ہے یہ امتحان مقتضی ہوا کہ انسان کو فی الجملہ آزادی بخشی جائے اس آزادی کی وجہ سے انسان نیکی اور بدی دونوں کی راہیں اختیار کر سکتا ہے پہلی راہ اُس کی فطرت کی راہ ہے اور اس پر اس کا چلنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے دوسری راہ فطرت اور خدا سے بغاوت ہے اور اس پر چلنا اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اس راہ پر چلنے کی بھی مہلت دیتا ہے کیونکہ اس مہلت کے بغیر آزادی کی نعمت بے معنی ہو جاتی ہے انسان کی یہ آزادی خدا کی بخشش اور اس کی مشیت کے تحت ہے اور یہ لازم نہیں ہے کہ جو بات خدا کی مشیت کے تحت ہو وہ اس کو پسند بھی ہو، وہ اتمام حجت کے لیے ان کاموں کے لیے بھی لوگوں کو ڈھیلتا ہے جو صریحاً اس سے بغاوت کے حکم میں

داخل ہوتے ہیں پس خیر ہو یا شر، کل اللہ ہی کی جانب سے ہے کوئی چیز بھی اس کی مشیت اور اختیار کے دائرہ سے باہر نہیں ہے نہ جبر محض کا دعویٰ صحیح ہے، نہ اختیار مطلق کا۔ حق ان دونوں کے درمیان ہے اور تفصیل اس کی ان شاء اللہ اپنے محل میں آئے گی۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس کائنات میں شر محض کا وجود نہیں ہے، شر حق کے ظلال کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور حق ہی کی خدمت کے لیے ہے، پس لازماً اس کائنات کا خالق حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی آپ سے آپ نکل آئی کہ خیر و شر، نور و ظلمت، راحت و مصیبت، نیکی و بدی اور کون و فساد کے الگ الگ دیوتا نہیں ہیں، ایک ہی ہے جس کے تحت تصرف یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے۔

۹۔ اشارات

اسی طرح توحید کی نہایت اہم دلیلیں ان لطیف اشارات (SUGGESTIONS) میں ملتی ہیں جو اس کائنات کے مختلف مظاہر میں مضمر ہیں اور یہ صرف ان کو نظر آتے ہیں جو باریک بین نظر اور عبرت پذیر قلب رکھتے ہیں یہ قرآنی دلائل کی ایک مخصوص قسم ہے جو منطق کی گرفت سے بالکل بالا ہے اور اس سے وہ قومیں بہت کم فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو استدلال کے مصنوعی طریقوں کی خوگر ہو کر استنباط و استنتاج اور عبرت و تنبہ کا وہ فطری جوہر کھو بیٹھی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ہر سلیم الفطرت انسان میں ودیعت فرمایا ہے، یہ جوہر صرف ان قوموں میں محفوظ رہتا ہے جو فطری سادگی پر قائم رہتی ہیں، اور اس اعتبار سے تمام قوموں میں اہل عرب کو جو بلند مقام حاصل تھا وہ معلوم ہے یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نہایت ذکی الحس تھے اور اشاروں میں وہ سب کچھ پڑھ لیتے تھے جو دوسرے موٹی موٹی کتابوں میں بھی پڑھ کے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جو لوگ عرب کے خطباء اور شعرائے جاہلیت کے کلام پر نظر رکھتے ہیں وہ ان کے اس ذوق سے اچھی طرح واقف ہیں، وہ منزلِ یار کے ایک ایک مٹے ہوئے نقش کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں، اس سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں اور پھر اس کی عبرتوں اور اس کے مخفی اشاروں اور پیغاموں کی ایسی موثر تصویر کھینچتے ہیں کہ سننے والے کا بھی دل بھر

آتا ہے قرآن سے پہلے ان کا یہ ذوق نظر، جس کے لیے عربی ادب میں صحیح لفظ ''توسّم'' ہے صرف دیار یار کے آثار ونشانات تک محدود تھا اور لازماً اس کے اثرات بھی معمولی اور ادنیٰ درجے کے تھے۔ قرآن نے ان کے اس ذوق کو شہ دی اور کائنات کے آثار وعجائب اور اس کے اشارات کی وسعتوں کی طرف توجہ دلائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوم زیادہ سے زیادہ امرؤالقیس اور زہیر کے درجہ کے اشخاص پیدا کرسکتی تھی اس کے اندر سے ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسی عظیم الشان ہستیاں اٹھیں۔

یہ اشارات قرآن کے تمام بنیادی مسائل: توحید، رسالت اور معاد کے سلسلہ میں نمایاں کیے گئے ہیں، یہاں سب کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، ہم صرف توحید سے متعلق ایک اشارہ کی توضیح کریں گے تاکہ دوسرے اشارات پر غور کرنے کے لیے نمونہ کا کام دے۔[1]

سورۂ رعد میں فرمایا ہے:

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ (الرعد ۱۳: ۱۵-۱۶)

''اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں، خواہ طوعاً خواہ کرہاً اور ان کے سائے بھی صبح اور شام۔ ان سے پوچھو: آسمانوں اور زمین کا مالک کون ہے؟ کہہ دو: اللہ!''

---

[1] اس کائنات کے اشارات حقیقت کی کوئی حد نہیں ہے جس طرح ہم عیسائیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گرجوں کی ہر چیز میں اپنے بنیادی عقائد کا مظاہرہ کرتے ہیں، مثلاً اگر تثلیث پیش نظر ہے تو عمارت کے ایک ایک گوشہ سے تثلیث نمایاں ہوگی، یہاں تک کہ فرنیچر کی قسم کی بھی جو چیزیں ہوں گی، سب مثلث ہوں گی، میز، قلم دان، قلم اور پیپر ویٹ تک سے تثلیث پکار رہی ہوگی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز میں توحید اور معاد کے حقائق کا مظاہرہ فرمایا ہے اور جس گوشہ پر بھی انسان تدبر کی نظر ڈالے، وہیں سے اس کو توحید اور معاد کی کوئی نہ کوئی دلیل ہاتھ آجائے گی، اسی کو بعض عارفوں نے کہا ہے: ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار۔ لیکن غافل انسان اتنے دلائل کے باوجود خدا کی توحید اور جزا کے باب میں بھٹک جاتا ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف ۱۲: ۱۰۵) (اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں تو ان سے منہ موڑے ہوئے)۔

طَوْعًا وَّ کَرْهًا کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کو سجدہ کرتے ہیں وہ تو کرتے ہی ہیں، لیکن جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کے آگے نہیں جھکتے انہیں مجبوراً جھکنا پڑتا ہے اور اس کے بعد اس مجبورانہ سجدہ کی شرح فرمادی کہ ان کے سائے صبح وشام خدا کا سجدہ بجالاتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر شخص اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کررہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ آفتاب کے زوال کے ساتھ آفتاب کی بالکل مخالف سمت میں زمین پر اس طرح جھکنا شروع ہوتا ہے جس طرح ایک رکوع کرنے والا خدا کے آگے جھکتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ یہ سایہ اس طرح زمین پر بچھ جاتا ہے جس طرح ایک ڈنڈوت کرنے والا اپنے معبود کے سامنے ڈنڈوت کرتا ہے، یا ایک ساجد خدا کے حضور سجدہ کرتا ہے اور پھر ایک شب زندہ دار کی طرح رات بھر اسی حالت میں پڑا رہتا ہے پھر جب صبح ہوتی ہے تو یہ سایہ بالتدریج سورج کی بالکل مخالف سمت سے اٹھنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پورے قیام کی حالت میں آجاتا ہے، جس طرح ایک مصلی سجدہ سے قیام کی حالت میں آگیا ہو اور پھر سورج کے زوال کے ساتھ اسی رکوع اور سجود کا دور آجاتا ہے، جو اوپر مذکور ہوا۔

یہ صورت حال دو نہایت اہم حقیقتوں کی شہادت دے رہی ہے، ایک یہ کہ اس کائنات کی ہر چیز چوبیس گھنٹے رکوع وسجود میں ہے دوسری یہ کہ یہ سجدہ آفتاب پرستی کے بالکل ضد ہے، آفتاب جب مشرق سے طلوع ہوتا ہے، ہر چیز کا سجدہ مغرب کی طرف ہوتا ہے اور جب مغرب میں غروب ہونے لگتا ہے، ہر چیز کا سجدہ مشرق کی طرف ہوتا ہے کسی وقت بھی کوئی چیز اپنے تکوینی سجدہ میں آفتاب کی موافقت نہیں کرتی، پھر اگر ایک انسان، جو ایک بااختیار مخلوق ہے، خدا کو سجدہ نہ کرے، بلکہ اس کے سامنے اکڑے یا سورج اور چاند کو سجدہ کرے تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ وہ خود تو خدا کے سامنے اکڑتا ہے لیکن اس کے سارے وجود کا سایہ خدا کے آگے بچھا ہوا ہے یا وہ خود تو سورج اور چاند کے آگے سجدہ کررہا ہے، لیکن اس کا سایہ ابراہیمی فطرت رکھتا ہے، جو کواکب پرستی سے بالکل بیزار اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (الانعام ۶:۷۹) (میں نے تو اپنا رخ بالکل یک سو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں) پر عامل ہے، عالم اختیار اور عالم تکوینی کی یہ بے ربطی ''من چہ می سرایم وطنبورہ من چہ می سراید'' کی مصداق ہے۔

یہی دلیل ہے جس کو قرآن نے دوسری جگہ کسی قدر مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ (النحل ۱۶:۴۸)

''کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ہے ان کے سائے دہنے اور بائیں منقلب ہوتے ہیں اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اور ان پر فروتنی ہوتی ہے۔''

قرآن میں اس طرح کے اشارات بہت ہیں اور ہر جگہ ان سے توحید، معاد اور رسالت کے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو قومیں صغریٰ و کبریٰ کی ترتیب کے بغیر کوئی بات نہیں سمجھ سکتی ہیں ان کے لیے بے شبہ ان اشارات کے اندر کوئی تعلیم نہیں ہے، لیکن عرب جیسی حساس قوم اس طرح کے اشارات سے نہ صرف یہ کہ فائدہ اٹھاتی تھی بلکہ ان کی اصلی عقلی غذا ان اشارات ہی میں تھی، یہ چیز تربیت عقل کے لیے بھی نہایت نافع ہے اور تاثیر کے اعتبار سے تو اشارات کی زبان تصریحات کے مقابلہ میں ہمیشہ بلیغ تر سمجھی گئی ہے، ہم ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بھی اپنے قلب پر وہ اثر نہیں کر سکتے جو تغلق آباد اور دلی مرحوم کے کھنڈروں پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر کر سکتے ہیں۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

باب ۲

توحید کے دلائل انفس

انسان پہلے ظاہر پر نظر ڈالتا ہے پھر جب عقل وتمیز میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ بات محض متوجہ ہونے کی حد تک موخر ہے ورنہ درحقیقت باطن ہی ہے جو اس کے سامنے ظاہر کو بھی بے نقاب کرتا ہے، اتنے دنوں تک اپنے باطن سے بے پروائی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کا باطن اس سے بہت دور ہے۔ نہیں، بلکہ یہ بے پروائی اس کے غایت قرب کی وجہ سے ہوتی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دلائل آفاق کی بنیاد درحقیقت انفسی دلائل ہی پر ہے۔ آسمان وزمین کے دلائل میں کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس کی اساس کسی نفسی دلیل پر نہ ہو، اسی پر ہمارے تمام استدلال کی عمارت قائم ہے اگر یہ نفسی دلائل نہ ہوتے تو جس طرح جمادات و بہائم کے لیے یہ تمام عالم تیرہ وتار ہے اسی طرح انسان کے لیے بھی یہ عالم ظلمات ہوتا، چنانچہ جو بلید آسمان وزمین کی آیتوں پر غور نہیں کرتے ہیں ان کے لیے یہ تمام عالم بالکل بے غایت اور بے معنی ہے اور قرآن نے ان کو چوپایوں سے بھی زیادہ بے عقل قرار دیا ہے۔

اب ہم اس باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے دلائل ہم سے قریب تر بھی ہیں، اور واضح تر بھی، دل نشیں بھی ہیں اور مستحکم بھی، جن کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿۲۰﴾ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ

(الذریت ۵۱: ۲۰-۲۱)

''اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے اندر بھی، کیا تم

دیکھتے نہیں؟''

اس آیت کا اسلوب بول رہا ہے کہ عالم نفس کے دلائل قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ اس قرب اور اس وضاحت کے باوجود وہ انسان کو نظر کیوں نہیں آتے! ان سارے دلائل کا احاطہ انسان کے لیے مشکل ہے ہم صرف بعض ایسی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور نہایت واضح ہیں۔

۱۔ عہد فطرت

توحید کے نفسی دلائل میں سب سے پہلی دلیل وہ ہے جس کی تشریح ہم نے اپنی اس کتاب کے حصہ ''حقیقت شرک'' کے آخری دو ابواب میں کی ہے یعنی انسانی نفس کے اندر ایک منعم حقیقی کا شعور سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ واضح ہے وہاں ہم نے علمائے سائنس کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ قدیم جذبہ خوف کا جذبہ ہے، جو کائنات کے مظاہر سے پیدا ہوا اور پھر اسی سے ان کی عبادت کا تصور ہوا۔ اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ خوف کا جذبہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس سے پہلے زندگی اور اسباب زندگی کے نعمت ہونے کا شعور انسان میں موجود ہو۔ جب تک زندگی کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو اس وقت تک اس کے متعلق کسی اندیشہ کا احساس بالکل بے معنی ہے اور نعمت کا شعور ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے اور منعم اور نعمت کا شعور انسان میں منعم کی شکر گزاری کا جذبہ اور تصور پیدا کرتا ہے یہ جذبہ نہ تو مجرد الف و عادت کی پیداوار ہے اور نہ محض اجتماعی و تمدنی زندگی کے تکلفات کا نتیجہ ہے، حیوانات تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔ ہم جن جانوروں کو اپنے گھروں میں پالتے ہیں، ان کے اندر بھی اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، ایک بلی سے لے کر ایک ہاتھی تک جن پر بھی ہم کوئی احسان کرتے ہیں، وہ اپنی مختلف اداؤں کی زبان سے اپنی سپاس گزاری اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی جذبہ، بہتر سے بہتر ترقی یافتہ صورت میں، انسان کے اندر موجود ہے جس کو ہم دوسرے

لفظوں میں، عدل سے تعبیر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے انسان کا یہ حال ہے کہ جس پیمانہ سے اس کے لیے ناپا جاتا ہے اسی پیمانہ سے وہ دوسروں کے لیے ناپتا ہے اور اسی جذبہ عدل نے خالص خدا پرستی اور توحید کی بنیاد ڈالی اور یہ توحید کے نہایت اہم دلائل میں سے ہے اس عدل فطری کا تقاضا ایک طرف تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق واجب کا پورا پورا اقرار کیا جائے اور دوسری طرف اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو حقوق خدا کے لیے واجب ہیں ان میں بلا وجہ دوسروں کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔ اس کو قرآن میں ظلم عظیم یعنی سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہوئے کہ سب سے بڑا عدل توحید ہے اور سب سے بڑا ظلم شرک۔

اس۔ ال کو قرآن نے انسانی فطرت کے عہد سے تعبیر کیا ہے

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (الاعراف ۷:۱۷۲)

''اور یاد کرو، جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ـــــ ان کی پیٹھوں سے ـــــ ان کی ذریت کو، اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر، پوچھا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے، ہاں، تو ہمارا رب ہے ہم اس کے گواہ ہیں یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔''

اس عہد کی حقیقت پر ہم نے ''حقیقت شرک'' کے آخری باب میں ایک مختصر تقریر لکھی ہے جس کے بعض حصے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

''بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے؟ ہمیں نہ تو اس اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کی کوئی خبر ہے نہ اس بَلٰى کی یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں، بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہو کہ قیامت کے دن یہ عہد بہر شکل ہر ابن آدم پر حجت ہوگا، لیکن حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا یہ بات نہیں

معلوم ہے کہ ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے، ماں، نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر اور کتنے دکھ اٹھا کر نو مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے، اپنے گوشت وخون سے اس کی پرورش کرتی ہے، پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغہ ءگوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے، پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جان کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کی غور و پرداخت اور تربیت ونگہداشت کا دور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے، اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے، اس سے زیادہ بچے کے لیے چاہتا ہے وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ اس کو کھلائے وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچے کو آرام پہنچے، وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ خطرہ سے محفوظ رہے ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے اگر اس میں ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

اب فرض کیجیے، بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے، اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی، لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق وفرائض یاد دلائے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ماں باپ کے کچھ حقوق وفرائض بھی ہیں، مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے، میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے، تو ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا کیونکہ وہ ایسے حق اور ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے، جس سے زیادہ ثابت اور مسلم ذمہ داری کوئی نہیں۔ یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ خود بخود لگی ہوئی ہوتی ہے، یہ بغیر تحریر کے نوشتہ، بغیر گواہی کے ثابت

اور بغیر مطالبہ کے مسلم ہے، یہ استحقاق (PRIVILEGE)۔اور ہ داری (RESPONSIBILITY) کا وہ فطری عہد ہے جس سے زیادہ انسان کو کوئی عہد بھی یاد نہیں۔''

''اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان ونفقہ اور حفاظت حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے وہ متمتع ہوتا ہے، اسی بنیاد پر آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت ونصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں، اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہوتی ہے، اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم وقابلیت، وقت اور آزادی جان اور مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑ جائے تو اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دیں، اب فرض کیجیے، ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا لیکن اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق وفرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے، یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کی حفظان صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی بتیوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے، اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے، لیکن جب ان کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ کی ذمہ داری سے بری ہوں، یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے حقوق سے متمتع ہو رہا ہے، اس کے امن وعدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری ہے، لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے

کہ میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کی جوکھم میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا، تو کیا اس کا جواب صحیح ہوگا؟ بیوی کہے گی کہ یہ عذر غلط ہے، جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک ''میثاق غلیظ'' کیا ہے اور زبان خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی، یہی سزا ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا، یہی سزا ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو اور ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی اور تمام دنیا اس سزا کو بالکل جائز اور واجبی قرار دے گی، کیونکہ ہر حق کے ساتھ فرض کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔''

''یہاں تک کہ اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی اور ہمارے تھان پر بندھے ہوئے گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں اُگے ہوئے پھول اور ہمارے باغ میں لگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں اور ہم نہایت لئیم آدمی ہوں گے اگر ان کا انکار کر دیں۔ ہم جس مرغی کے انڈے اور چوزے کھاتے ہیں لازم ہے کہ بلیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں، ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، گوڑیں، کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لو کی مصیبتوں سے بچائیں، ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کیا ہے، یہ استحقاق اور

ذمہ داری کا وہ عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں۔"

"اب غور کرو کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار نہیں ہے تو ان سے ہمیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو بھی پیدا کیا، جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا، جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کا حق مانتے ہیں اور اس کو ایک معاہدہ عمرانی کا درجہ دیتے ہیں تو وہ جس نے خاندان و قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہ اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہد ربوبیت کا اقرار کریں، جب ہم مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں اور گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق و ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو جس نے گائے، گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے ساز گار اور نفع رساں بنایا"

اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے منعم کے حقوق کا اقرار کرے اور منعم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس شکر گزاری کی جائے اور اس شکر گزاری میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ یہی حقیقت ہے جو بعض احادیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ بندہ پر خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کسی کو اس کا ساجھی نہ ٹھہرائے۔ یہی دلیل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۞ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۞ قَالُوْا
نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۞ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۞
اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۞ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۞
قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۞ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۞
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۞
وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ ۞ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۞ وَالَّذِيْ
يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۞ وَ الَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ

(الشعراء۲۶:۶۹-۸۲)

"اوران کوابراہیم کی سرگزشت سناؤ، جب کہ اس نے اپنے باپ اوراپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھلا یہ تم لوگ کن چیزوں کی پرستش کرتے ہو! انہوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابران کی پوجا پر جمے رہیں گے! اس نے کہا، کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو یا تمہیں نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں! انہوں نے کہا، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کوایسا ہی کرتے ہوئے پایا ہے، اس نے کہا، کیا تم نے ان چیزوں پر غور کیا ہے جن کو تم پوجتے رہے ہو۔ تم بھی اور تمہارے اگلے آباءواجداد بھی! یہ سب میرے تو دشمن ہیں، بجز اللہ رب العالمین کے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہ میری رہنمائی فرماتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے اور جو مجھے موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا اور وہ جس سے میں متوقع ہوں کہ جزا کے دن میرے گناہ معاف کرے گا۔"

یعنی ایک منعم ہستی جس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہیں دیا، بلکہ ہم کو فطرت کی اور پھر الہام کی ہدایتیں بخشیں، جس نے ہمیں کھلایا پلایا، جس نے ہمیں بیماری کے بعد صحت بخشی، جو ہمیں موت دیتی ہے اور پھر ہمارے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے ہمیں زندہ کرے گی اور جس کے رحم وکرم سے توقع ہے کہ اس کا معاملہ آخرت میں بھی ہمارے ساتھ اچھا ہوگا، بلا شبہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس کی شہادت اور دلیل ہمارے پاس موجود ہے ہمارا فطری عدل تقاضا کرتا ہے کہ ہم منعم کے احسان کا حق، اس کی

شکر گزاری کی صورت میں، ادا کریں اور اسی عدل ہی کا تقاضا ہے کہ جو حق اللہ تعالیٰ کا ہے بے دلیل اس میں دوسروں کو شریک نہ ٹھہرائیں، یہ حد درجہ کی ناانصافی اور نہایت کھلا ہوا ظلم عظیم ہے۔

۲۔ علم و یقین کی فطری طلب

انسانی فطرت کی دوسری نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تاریکی کے مقابل میں روشنی، جہل کے مقابل میں علم اور حیرانی و سرگشتگی کے مقابل میں طمانیت اور شرح صدر بالطبع مرغوب ہے، انسان اس کو برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کائنات کا اس کے سامنے کوئی حل نہ ہو، اس کے آغاز و انجام کے بارہ میں وہ بالکل اندھیرے میں ہو، وہ اپنی ہستی کی غایت، اور اس کے نیک و بد سے بالکل بے خبر ہو، کچھ نہ جانے کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا، اپنے ساتھ کیا معاملہ کرے اور دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرے۔ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان سارے سوالات پر غور کرے، ان کا حل تلاش کرے اور ہر ایک پر نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم لگائے، وہ یہ تو کرسکتا ہے کہ کسی سوال کا کوئی غلط حل پیدا کرلے اور اسی پر جم جائے، لیکن یہ نہیں کرسکتا کہ ان سوالات سے یکسر کوئی تعرض ہی نہ کرے، انسان کے لیے ظلمات میں بھٹکتے پھرنا بالکل ناممکن ہے۔

انسان کی یہی وہ فطری طلب ہے جس کی وجہ سے وہ جستجو کی مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور بسا اوقات اس نے کوئی صحیح چیز نہ پاکر کسی غلط چیز کو اختیار کرلیا ہے، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ ان سوالات سے بالکل بے پروا ہوکر بیٹھ رہا ہو۔ یہ ایک فطری پیاس ہے جس کا بجھنا ضروری ہے اور جس چیز سے یہ پیاس ٹھیک ٹھیک بجھ جائے وہی اس کا صحیح جواب ہے یہ پیاس صرف اللہ کے ایمان سے بجھتی ہے اس کے سوا دوسری چیزیں صرف غیر فطری بہانے ہیں جن سے طبیعت کو دھوکا تو دیا جا سکتا ہے، لیکن طمانیت نہیں حاصل کی جا سکتی، طمانیت صرف اللہ کو ماننے میں ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ

الْقُلُوْبُ (الرعد ۱۳:۲۸) (سن لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے)۔ یہی وہ روشنی ہے جس کے چمکتے ہی یہ پوری کائنات اور اس کا سارا آغاز و انجام آشکارا ہو جاتا ہے: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور ۲۴:۳۵) (اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے)۔ اس کو پا لینے کے بعد انسان کے سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں، اب وہ اس کائنات کے آغاز و انجام کا تصور کر سکتا ہے اس وسیع کائنات میں اپنی ہستی کا مقام متعین کر سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے، اب اس کے لیے اخلاق کے اصول، معیشت کے ضابطے، سیاست کے آئین، سب طے ہو سکتے ہیں، اب وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں کے بارہ میں علیٰ وجہ البصیرت ایک فیصلہ کر سکتا ہے، محض اٹکل کے تیر تکے نہیں چلائے گا، اب اسے اپنے عقل وحواس کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں رہے گی اور اپنے آپ کو مایوسی اور حقارت کی نظر سے بھی نہیں دیکھے گا اور جس راہ میں جو بھی قدم رکھے گا وہ نہایت مضبوط اور محکم ہوگا۔

اس کے بعد اگر کوئی شخص اس حل کو اس وجہ سے نہیں قبول کرتا کہ ممکن ہے اس کے عقل وحواس اسے دھوکا دے رہے ہوں تو یہ نہایت بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے، بے شبہ انسان کے حواس غلطی کر جاتے ہیں، لیکن وہ غلطی ہی کرنے کے لیے نہیں بنے ہیں، بے شک ہماری عقل کبھی نتائج نکالنے میں چوک بھی جاتی ہے، لیکن یقیناً وہ انسان کو فریب دینے پر نہیں مامور ہے، یہ صحیح ہے کہ انسانوں کی رایوں اور ان کے فیصلوں میں نہایت شدید اختلافات ہیں، لیکن ان کے اندر اتفاق کے جو پہلو ہیں ان کو نظر انداز کر دینا ہدایت کا انکار ہے، یہ ارتیابیت انسان کی فطرت کے بالکل خلاف ہے، یہ ایک مصنوعی حالت ہے جو بتکلف انسان نے اختیار کی ہے، ورنہ اس کی زندگی کا ایک ایک فعل اس کے یقین کا شاہد ہے، وہ یقین پر مجبور ہے اور بغیر یقین کے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا، وہ ایک ''لاادری'' کہنے میں اپنے متعدد یقینوں کا اعلان کرتا ہے اور اس کے تمام یقینوں میں سے بڑا یقین اس ہستی کا یقین ہے جس کی شہادت اسے اپنے اندر اور باہر سے مل رہی ہے اور جس کو مانے

بغیر یہ تمام عالم بالکل ظلمات ہے، انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ تاریکی پر راضی ہو سکے، الّا آنکہ وہ اپنی فطرت کو مسخ کر ڈالے، پس خدا کے وجود اور اس کے تمام صفات کمال سے متصف ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کائنات کے معمہ کا اور خود اپنی ہستی کا انسان کو کوئی حل نہیں ملتا۔ صرف یہی ایک حل ہے جو تشفی بخش ہے، جس سے ساری گرہیں کھل جاتی ہیں اس حل کی صحت اور صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ قلب کی تشنگی کا صحیح تر جواب اور عقل کی جستجو کا اصل مطلوب ہے اس کے لیے کسی اور عقلی و نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دلیل وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں دلیل اصل دعویٰ سے زیادہ روشن ہو۔ یہاں خود دعویٰ اس قدر روشن ہے کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ روشن نہیں۔

پس ایک خدا کو ماننا، جو تمام کمال سے متصف ہے، انسان کی فطرت ہے یہ حق اس کے بعد اگر کسی نے کچھ اور خدا بنا لیے ہیں تو یہ ضلالت اور گمراہی ہے، کیونکہ ایک خدا کو مان لینے کے بعد فطرت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے اب اس سے کسی زائد شے کو ماننا ایک امر واقعی پر ایک بالکل غیر ضروری اضافہ ہے اور کھلی ہوئی ضلالت ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (یونس ۱۰:۳۲) (تو حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے) اسی وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا کیساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے یعنی ایک خدا کو ماننا تو اس لیے ضروری ہے کہ فطرت انسانی اس کے بغیر تشفی نہیں پا سکتی اور اس کی شہادت انسان کے اندر اور باہر موجود ہے، لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک کرنا ایک بالکل بے ثبوت بات ہے:

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۝ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (المومنون ۲۳:۱۱۶-۱۱۷)

"تو بڑی ہی برتر ذات ہے اللہ بادشاہ حقیقی کی اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عرش کریم کا مالک اور جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور الٰہ کو بھی پکارے گا، جس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل

نہیں، تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا اور کافر فلاح نہیں پائیں گے۔"

یعنی ایک خدا کی شہادت تو انسان اپنے اور باہر سے پا رہا ہے، اس لیے اس کو ماننا عقل وفطرت کا تقاضا ہے، لیکن اس کے علاوہ اگر کسی اور کو بھی وہ خدائی میں شریک ٹھہراتا ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، تو یہ انسان کی بدبختی ہے ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایک مشرک کے مقابلہ میں ایک موحد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا اثبات کرے یا شرکاء کے ابطال پر دلائل قائم کرے، کیونکہ مشرک ایک خدا کو تو بہر حال مانتا ہی ہے، یہ چیز تو مشرک وموحد کے درمیان مشترک ہے، باقی رہے شرکاء وانداد جو اس نے اپنے جی میں فرض کر رکھے ہیں تو پہلے ان کے ثبوت کے دلائل کی ضرورت ہے نہ کہ ان کی تردید کے دلائل کی، ان کی تردید کے لیے تو یہ دلیل کافی ہے کہ ان کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

۳۔ فطرت انسانی کا علوّ

توحید کی ایک بہت بڑی نفسی دلیل فطرت انسانی کا علو ہے، انسان بالطبع ذلت واطاعت اور بندگی وغلامی سے نفرت کرتا اور سروری وسرفرازی کا خواہش مند ہے وہ جس وقت اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے کرشمے دیکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک وجود بھی نہیں جو اس کی ہم سری کر سکے، اس احساس برتری کی ایک بہت بڑی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ ہے اور فطرۃً اس اشرفیت اور اس خلافت کا احساس لے کر اس دنیا میں آیا ہے اگر اس منصب کے لحاظ سے اس میں سربلندی وبرتری کا احساس نہ ودیعت کیا گیا ہوتا تو یقیناً وہ اس منصب کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال سکتا۔ یہ حقیقت نہایت عمدہ طریقہ پر اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (الاحزاب ۳۳:۷۲) (اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بے شک وہ ظلم کرنے

والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے) میں بیان ہوئی ہے لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے یہی احساس ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بسا اوقات خدائی کے دعوے کر بیٹھتا ہے کبھی اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (النازعات ۷۹: ۲۴) (تمہارا ربِّ اعلیٰ تو میں ہوں) پکار اٹھتا ہے کبھی اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ (البقرہ ۲:۲۵۸) (میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں) کی رعونت کا اظہار کرتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو قوموں کی گردنوں کا مالک اور خشکی و تری کا سلطان سمجھنے لگتا ہے اور بندہ کی جگہ طاغوت بن کر خدا کی زمین میں اپنا قانون اور اپنا فرمان چلانے لگتا ہے لیکن اس احساس برتری کے ساتھ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتیں اور قابلیتیں بچپنے بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں تو اسے ناچار خدائی کا تخت چھوڑ کر بندگی کی صف میں آ کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی اس پیشانی کو جو کسی کے آگے جھکنا نہیں چاہتی ایک ایسی طاقت کے آگے جھکانا پڑتا ہے جو تمام قویٰ اور قابلیتوں کا سرچشمہ اور آسمان و زمین کی مالک و مدبر ہے ظاہر ہے کہ یہ فروتنی انسان اس لیے نہیں اختیار کرتا کہ اس میں بالطبع کہتری کا احساس یا کسی کو خدا بنانے کا شوق ہے اس میں اصلی ولولہ تو خدا بننے کے لیے ہے، لیکن جب وہ اپنے حوصلوں کی بلند پروازیوں کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کی نارسائیوں کو دیکھتا ہے تو ناچار اسے ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دینا پڑتا ہے ایسا کرنے پر انسان مضطر ہے، اگر وہ اس سے بچ سکتا تو یقیناً اس کی خواہش یہی ہوتی کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچا لے جائے لیکن وہ مجبور ہے کہ ایک بالاتر ہستی کا اقرار کرے جس کی قدرت کاملہ سے یہ سارا کارخانہ وجود میں آیا اور جس کی حکمت و تدبیر سے یہ سارا نظام چل رہا ہے، یہ کبر نفس اور علو کا داعیہ انسان میں اتنا سخت و شدید ہے کہ بسا اوقات یہ کسی طرح بھی اعتراف حق پر راضی نہیں ہوتا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے، جو مدعی تھا کہ ''میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں'' اس لیے میں ہی رب ہوں، ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہہ کر کہ ''اللہ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے'' تم اسے مغرب سے طلوع کر دو، اس کے عجز کو

بالکل بے نقاب کر دیا اور وہ اس معارضہ سے ہکا بکا ہو کے رہ گیا۔ لیکن کبر نفس کا شیطان اتنا سرکش ہے کہ لاجواب ہو کر بھی وہ خدا کے اقرار پر راضی نہ ہوا۔ لیکن جن کی عقل درست اور فطرت سلیم ہوتی ہے وہ اپنے علوّ اور اپنے ضعف دونوں کے توازن کو قائم رکھتے ہیں وہ ایک حکیم و مدبر ہستی کے آگے جھک کے اپنے ضعف کی تلافی اور اپنی ناتوانی کا علاج پا لیتے ہیں اور ان کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے اس کے بعد اگر کوئی شخص کسی اور آستانہ پر جھکتا ہے تو اس کی مثال اس دنی الطبع گدا کی ہے جو ایک دروازہ سے اپنی تمام مایحتاج پا لینے کے باوجود دردر صدائے سوال بلند کرتا پھرتا ہے اور اس کی طبیعت کی دناءت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ بسا اوقات اپنے سے زیادہ ذلیل و بے بس محتاجوں کے آگے ہاتھ پھیلا دینے میں بھی اس کو کوئی شرم نہیں لاحق ہوتی۔

ظاہر ہے کہ یہ حالت انسان کی اصلی فطرت نہیں بلکہ فطرت کا بگاڑ ہے جس طرح گداؤں کی کثرت کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی اصلی فطرت خودداری اور عزت نفس ہے، اسی طرح مشرکوں کی کثرت کے باوجود انسانی فطرت کا اصلی تقاضا توحید ہے ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتی ہے جو ایک قوّام کی قوامیت کے بغیر نہیں بھر سکتا، اب اگر کوئی عورت ایسی ہے جو اس خلا کو بھر لینے کے باوجود دوسروں سے آشنائی کرتی پھرتی ہے تو وہ چھنال ہے جس نے اپنا جوہر عفت اور جمال غیرت بالکل کھو دیا ہے۔

پس جو شخص خدا کو مانتا ہے وہ اس لیے نہیں مانتا کہ اسے خدا بنانے کا شوق ہے، بلکہ اس لیے مانتا ہے کہ اسے خدا کی احتیاج ہے، وہ تمام قوتوں اور قابلیتوں کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس کر رہا ہے جو ایک خدا مانے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اس کو مان لینے کے بعد وہ خلا پر ہو گیا اب اگر کوئی اس سے یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو بندگی کے مستحق ہیں تو وہ تو یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میرے لیے ایک خدا بس ہے اگر تمہیں دوسرے آستانوں پر بھی پیشانی رگڑنے کی تمنا ہے تو تم یہ ذلت گوارا کرو، مجھے اس سے معاف رکھو۔

انسانی فطرت کی اسی بلندی کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں کے سامنے کی ہے:

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ

(یوسف ۱۲: ۳۸-۴۰)

''اور میں نے اپنے بزرگوں، ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی، ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں یہ اللہ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے، اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں، یا اکیلا اللہ ہی سب پر حاوی و غالب؟ تم اس کے سوا نہیں پوجتے ہو مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری، اختیار و اقتدار صرف اللہ ہی کا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو، یہی دین قیم ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

اس تقریر کے ابتدائی حصہ کی روح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے سوا کسی کی عبادت و بندگی کا حکم نہیں دیا اور انسان کے اندر برتری اور سربلندی کا جو احساس ودیعت فرمایا اس کی حرمت و عزت کا خود اس درجہ لحاظ فرمایا کہ غیر کے آگے جھکنے کی ذلت سے اس کو بچایا اور صرف اپنے ہی آگے جھکنے کا حکم دیا، لیکن انسان نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کیا اور بلا کسی سبب کے اس نے اپنی نفس کی حرمت کو بٹہ لگایا اور اپنے سے زیادہ حقیر و ذلیل مخلوقات کی پرستش کی، اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو ماننا ایک ضرورت ہے اور انسان، اپنے نفس کے علوّ کے باوجود، اس لیے خدا کو مانتا ہے کہ اس کے مانے بغیر اس کی

فطرت کا خلا پر نہیں ہوتا، اب سوال یہ ہے کہ بہتر کیا ہے؟ کیا یہ کہ بہت سے الگ الگ آقا اور رب ہوں اور ان سب کی غلامی کی جائے یا یہ کہ صرف ایک ہی خدائے واحد وقہار کی اطاعت کی جائے، ظاہر ہے کہ خوددار انسان کے لیے ایک ہی رب کی غلامی بہت ہے، وہ بہت سے ارباب کیوں تراشے گا! رہی یہ بات کہ اسی ایک نے بعض دوسروں کی اطاعت کا حکم بھی دیا ہو تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، اس کے بالکل برعکس اس کا حکم یہ ہے کہ تنہا اسی کی بندگی کی جائے اور یہی فطری دین ہے یعنی انسانی کی فطرت بھی اس ایک کی شہادت اپنے اندر اور باہر پا رہی ہے، لیکن بہتوں نے اپنے اس فطری دین کو نہیں پہچانا اور شرک کی وادیوں میں بھٹک گئے۔

انسان فطرت کے اسی علوّ کی بنا پر موحّد ومشرک کی ایک تمثیل بھی بیان ہوئی ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع توحید کو پسند کرتا ہے، نہ کہ شرک کو:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر ۳۹:۲۹)

''اللہ تمثیل بیان کرتا ہے ایک غلام کی جس میں کئی مختلف الاغراض آقا شریک ہیں اور ایک دوسرے غلام کی جو پورے کا پورا ایک ہی آقا کی ملک ہے، کیا ان دونوں کا حال یکساں ہوگا! سزاوار شکر صرف اللہ ہے لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی۔''

یعنی بہت سے مختلف المزاج اور مختلف الاغراض آقاؤں کی غلامی کو اپنی پسند سے کون گوارا کر سکتا ہے؟ تو جب کوئی غلام اس ذلت پر راضی نہیں ہوتا تو پھر انسان یہ کیوں گوارا کرتا ہے کہ ایک خدا کے ساتھ اپنے جی سے دوسرے بہت سے خداؤں کو شریک کر لیتا ہے: کیا ایک آقا کے غلام اور بہت سے آقاؤں کے غلام کا حال یکساں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اس کے بعد فطرت انسانی کی صدائے حال بتائی کہ الحمد اللہ، یعنی شکر کا سزاوار صرف اللہ ہی ہے کوئی اور اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔

انسان کے اسی علوئے فطرت کو مخاطب کر کے سوال کیا گیا ہے:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ؕ (الزمر ۳۹:۳۶)

''کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے!''

یہی علوئے نفس ہے جس کو انسان شرک میں آلودہ ہوتے ہی کھو بیٹھتا ہے اور دفعتہً رفعت وعزت کے اس آسمان سے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز فرمایا ہے، انتہائی ذلت کی پستی میں گر جاتا ہے:

وَ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰہِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِیْقٍ (الحج ۲۲:۳۱)

''اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔''

دوسری جگہ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ یُّهِنِ اللّٰہُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ﴿۱۸﴾ (الحج ۲۲:۱۸)

''کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے آگے جھکتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور لوگوں میں سے بہتیرے ایسے ہیں جن پر خدا کا عذاب لازم ہو چکا ہے اور جن کو خدا ذلیل کر دے تو ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا، بے شک اللہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

اس آیت میں انسان کی جس ذلت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ تمام اشیائے کائنات صرف اللہ واحد کو سجدہ کرتی ہیں اور باوجود یکہ اللہ تعالیٰ نے ان ساری چیزوں کو انسان کی خدمت گزاری اور نفع رسانی میں سرگرم کر رکھا ہے، لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا نہیں کرتی کہ انسان کی بندگی کرے، البتہ انسان ہے کہ ان ساری

چیزوں پر فضیلت رکھنے اور ان کا مخدوم ہونے کے باوجود ان میں سے اکثر چیزوں کا پرستار بنا ہوا ہے۔

۴۔ انسان کا ضعف و افتقار

چوتھی چیز انسان کا ضعف و افتقار ہے، ضعف و افتقار انسان کی صفت ذاتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہیں ہوتی، بے شبہ انسان قوتوں اور قابلیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اپنے اندر رکھتا ہے، وہ اپنی ان قوتوں کی بدولت زمین کے مدفون خزانے اگلوا لیتا ہے، فضاؤں میں اپنا تخت حکومت بچھاتا ہے، پہاڑوں کا سینہ چاک کر ڈالتا ہے سمندروں پر اپنے جہاز دوڑاتا ہے لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ناتوانی کو جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ وہ خود کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ سے وہ یہ سارے تصرفات کر رہا ہے ان میں سے کسی قابلیت کو بھی وہ وجود میں نہیں لایا ہے اور نہ جن چیزوں پر وہ تصرف کرتا ہے ان میں کسی چیز کو اس نے پیدا کیا ہے یہ ساری چیزیں کسی اور ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور اسی کے بنائے ہوئے قانون طبیعی کی پابند بھی ہیں، انسان کے اختیار میں جو کچھ ہے وہ بس اتنا ہے کہ کوشش کر کے ان کے قوانین کو سمجھے اور پھر ان قوانین کے مطابق ان سے کام لے اور فائدہ اٹھائے اور یہ تمتع بھی بس ایک ہی مدت تک ہے جس کے پورے ہو جانے کے بعد وہ لاکھ چاہے، لیکن ان میں کسی چیز سے ایک پل کے لیے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، یہ چیز انسان میں فطری طور پر ایک ان دیکھی ہستی کی احتیاج پیدا کرتی ہے جس نے اس کو اور ان ساری چیزوں کو وجود بخشا ہے اور جس کے جاری کیے ہوئے قوانین کے مطابق یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ انسان کا یہی ضعف و افتقار ہے جس کی وجہ سے فرمایا گیا ہے: اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ (فاطر ۳۵:۱۵) (تمہی اللہ کے محتاج ہو) دوسری جگہ فرمایا ہے: وَ اللّٰہُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد ۴۷:۳۸) (اور اللہ بالکل بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو)۔

جو عاقل ہیں وہ زندگی کے ہر دور اور اس کے ہر تغیر میں اپنی احتیاج کو محسوس کرتے رہتے ہیں اور کبھی خدا سے مستغنی اور بے پروا نہیں ہوتے، بلکہ ان پر نعمتوں کی فراوانی جس

قدر بڑھتی جاتی ہے خدا سے ان کا تعلق اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، ذوالقرنین اور فاروق اعظمؓ ہیں۔ لیکن جو کم ظرف اور بلید ہوتے ہیں، وہ بسا اوقات اپنے اردگرد دولت کی فراوانی، خدم وحشم کی کثرت اور طاقت وقوت کے کرشمے دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتے ہیں، قرآن میں اس کی مثال کے لیے فرعون، ہامان، قارون اور ابولہب، وغیرہ کے نام پیش کیے گیے ہیں جو اس عہد کے فرعونوں ہامانوں، قارونوں اور بولہبوں کے ائمہ ضلالت ہیں۔

جن لوگوں پر اس طرح کی خیرگی طاری ہوتی ہے ان کے لیے قرآن نے جگہ جگہ انسان کے فطری ضعف وافتقار کو مختلف تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے کہ انسان کتنی ہی رعونت اور خدا سے غفلت و بے پروائی کا اظہار کرے، لیکن اس کی زندگی میں بارہا ایسے حالات پیش آتے ہیں جو اس کی بے بسی اور ناتوانی کا راز کھول ہی دیتے ہیں اور اس وقت اس کے منہ سے وہ چیخ نکل ہی پڑتی ہے جو اس کی فطرت کی پکار ہے، اس حالت میں اس کے تمام شرکاء خواہ اپنی ذات ہو یا اس کے لاؤ شکر یا اس کے غیبی شرکاء وانداد، سب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ایک ہی ذات بچ رہتی ہیں جس کا دامن رحمت اس کو پناہ دیتا ہے یہ دلیل قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (الانعام ۶: ۶۳-۶۴)

''ان سے پوچھو، خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم کو کون نجات دیتا ہے، جب کہ اسی کو تم پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکرگزار بندوں میں سے بن جائیں گے؟ کہہ دو، اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے اس مصیبت سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے، لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو۔''

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ

كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ (یونس ۱۰:۲۲-۲۳)

''وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں ہوائے موافق سے چل رہی ہوتی ہے اور وہ اس میں مگن ہوتے ہیں کہ دفعتہً ایک باد تند آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم ہلاک ہوئے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں، خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس آفت سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہو کر رہیں گے تو جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے وہ نجات پاتے ہی زمین میں، بلا کسی حق کے سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لوگو، تمہاری سرکشی کا وبال تمہارے ہی اوپر آنے والا ہے چند دن دنیا کی زندگی کا نفع اٹھا لو، پھر تمہاری واپسی ہماری طرف ہے، پھر ہم تمہیں تمہاری کرتوتوں سے آگاہ کریں گے۔''

سرکش انسان کی سرکشی اور اس کے تمرد و استکبار کی یہ کتنی سچی مثال ہے، دنیا کے سمندر میں جب اس کی زندگی کی کشتی بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہتی ہے، وہ اپنی کشتی کے استحکام اور اپنے حسن انتظام پر مغرور رہتا ہے، اپنی تدبیر و دانش کو بڑی چیز سمجھتا ہے، اپنے وسائل و ذرائع پر اتراتا ہے اور خدا کی اطاعت و شکر گزاری سے باہر ہو کر بغیر کسی استحقاق کے اپنی خدائی کا اعلان کرتا ہے، غرور سے اکڑتا ہے، گھمنڈ سے اتراتا ہے، فخر کے نشہ سے بدمست ہو جاتا ہے، لیکن جب دفعتہً ساز گار ہوا طوفانی بن جاتی ہے کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگتی ہے اور موجوں کے تھپیڑے کشتی کو ایک پرکاہ اور اس کے سارے تدبیر و نظام کو بے حقیقت ثابت کر دیتے ہیں، اس کے منہ سے بے تحاشا چیخ نکل پڑتی ہے کہ اے خدا! اگر اس ورطہ ہلاکت سے تو نے نجات بخشی تو اب کبھی تجھ سے غفلت نہ ہوگی، اب کبھی گھمنڈ نہ کروں گا اور کبھی تیری خدائی میں ساجھی بننے کی جرأت نہ کروں گا، بلکہ تیرا شکر گزار بندہ بنوں گا اور تیری ہی اطاعت کروں گا۔ نہ اپنی اطاعت کروں گا نہ کسی اور کی، لیکن جوں ہی اس آفت سے نجات پا جاتا ہے پھر وہی غفلت اور سرمستی عود کر آتی ہے اور اپنے جس سروسامان اور

جس گھمنڈ کو اس نے اتنا بے حقیقت پایا تھا ان ہی کے نشہ میں مخمور ہو کر پھر خدا کا باغی اور مشرک بن جاتا ہے ایسے لوگوں کو خدا نے ''ختار'' اور ''کفور'' عہد شکن اور ناشکر گزار کہا ہے، کیونکہ فطرت کے جس عہد کو مصائب کے تازیانے آ کر یاد دلاتے ہیں اور انسان اس کی تجدید کرتا ہے، حالات کے بدلتے ہی اس عہد کو توڑ کر پھر کفرانِ نعمت کی حالت اختیار کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کے اندر افتقار و احتیاج کا احساس بالکل فطری ہے اور یہ افتقار اسے دھکیل کر ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتا ہے جو اسکے لیے مامن و ملجا ہو، اگر انسان پر اس کا یہ افتقار آشکار ا رہے تو وہ کبھی انانیت، خودسری، رغونت اور بغی و استکبار کے شرک میں مبتلا نہ ہو، لیکن وہ اکثر خدا کی نعمتیں پا کر اپنے ضعف و احتیاج کو بھول جاتا ہے لیکن بس بھول جاتا ہے، اس کی فطرت بدل نہیں جاتی چنانچہ جوں ہی اس پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جو اس کے فریب اطمینان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے، اس کی دبی ہوئی فطرت پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے۔

سرکش سے سرکش انسانوں میں ہم اس فطرت کو جاگتے اور ابھرتے دیکھتے ہیں، مغرور سے مغرور انسان جو قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (القصص ۲۸:۷۸) (مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم کی بدولت ملا ہے) کے گھمنڈ میں خدا کو بھول گئے تھے، جنہوں نے بغیر کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں اپنی خدائی کے علم گاڑ دیے تھے، جن کو اپنی تدبیروں اور اپنے استحکامات پر اتنا ناز تھا کہ خدا کے نام پر ہنستے تھے، آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تدبیروں کی ناکامی اور ان کے استحکامات کے بودے پن نے ان پر انسان کی بے بسی کا راز کھول دیا ہے اور وہ خدا کا نام لینے لگے ہیں لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (الطلاق ۶۵:۱) (شاید اللہ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے)۔

باب ۳

توحید کے خصوصی دلائل

دلائل بلحاظ مسلمات مخاطب

اوپر کے دو ابواب میں ہم نے الوہیت اور توحید کی وہ دلیلیں بیان کی ہیں جن کی حیثیت عام دلائل کی ہے، ان کی اساس اس کائنات کے نوامیس وسنن اور فطرت انسان کے اذعانات ومسلمات پر ہے اس وجہ سے، ہر چند ان کے مخاطب اوّل عرب ہیں، لیکن ان کی حجت تمام نبی آدم پر بلا امتیاز عرب وعجم اور بلا لحاظ کافر ومومن، یکساں اور عام ہے یہ صحیفۂ کائنات ہر شخص کے سامنے کھلا ہوا ہے اور فطرت کے شہادتیں بھی ہر قلب سلیم کے اندر سے بول رہی ہیں، صرف وہی لوگ ان حقائق کے انکار کی جرأت کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہوں اور اپنے کان بہرے کر لیے ہوں، ایسے لوگوں کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی ۔ اب ہم اُن دلائل کی توضیح کریں گے، جن کی بنیاد مخالف کے اعترافات پر قائم ہے ان کی حیثیت خصوصی دلائل کی ہے یعنی مخاطب جن صحیح اصولوں کو تسلیم کرتا ہے قرآن نے ان کو اپنا لیا ہے اور ان کی اساس پر ان کے مقتضیات ولوازم کی تشریح کر کے مخاطب سے ان کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی جو باتیں ان مسلمات سے متناقض ہیں ان کی نفی کا مطالبہ کیا ہے استدلال کا یہ اسلوب بالکل عقلی وفطری ہے، اس پر یہ اعتراض کرنا کہ اس میں اساس استدلال بے ثبوت رہ گئی ہے بالکل لغو بات ہے استدلال کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اس اصل کو بھی مدلل ومبرہن کرنے پر وقت ضائع کیا جائے جو حریف کے نزدیک مسلم ہے انہی دلائل کی وجہ سے ہمارے بعض فلاسفہ ومتکلمین کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ

قرآن کے سارے دلائل الزامی قسم کے ہیں اور ایسے برہانیات سے قرآن بالکل خالی ہے جن کی حجت تمام انسانوں پر عام ہو سکے۔ یہ خیال قرآن سے بے خبری پر مبنی ہے یہ تو قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے، جس کی بنیاد ایک طرف مخاطب کے اعتراف پر ہے اور دوسری طرف ان برہانیات پر ہے جن کی شرح ہم پچھلے دو ابواب میں کر آئے ہیں۔ اب ہم اس کی توضیح کی کوشش کریں گے۔

ا۔ شرکاء کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے

اس بات میں قرآن نے عربوں پر سب سے بڑی حجت یہ قائم کی ہے کہ جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ان کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ خدا کا سوال تو خارج از بحث ہے کیونکہ اسے تو تم مانتے ہی ہو اور اس کی شہادت آفاق و انفس سے بھی مل رہی ہے، لیکن اس کے سوا جن کو تم نے خدائی میں شریک بنا رکھا ہے ان کی دلیل لانا تمہارا فرض ہے۔ بغیر دلیل کے کسی معمولی بات کو بھی ماننا انسان کی فطرت کے خلاف ہے چہ جائیکہ کسی کو خدا کا دست و بازو قرار دینا۔ پس اگر اس کی کوئی عقلی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو اور اگر کوئی نقلی دلیل ہے تو اس کو سامنے لاؤ، رہی یہ بات کہ تم نے اپنے بزرگوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے تو یہ کوئی سند نہیں ہے اتنے بڑے دعوے کے ثبوت کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہو سکتی:

وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ

(المؤمنون ۲۳:۱۱۷)

''اور جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور اللہ کو بھی پکارے گا، جس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا۔''

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ

اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (یوسف ۱۲:۴۰)

''تم اس کے سوانہیں پوجتے ہو مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔''

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (الروم ۳۰:۳۵)

''کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل اتاری ہے جو ان چیزوں کی شہادت دے رہی ہو، جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں!''

اہل عرب اس کے جواب میں یہ کہتے کہ ہمارے بزرگوں نے جو شرک اختیار کیا وہ خدا کے حکم سے کیا اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم ہے قرآن نے اس کا جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے خدا نے کبھی شرک کا حکم نہیں دیا ہے۔ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی ایسی سند پیش کرو جس کی بنیاد علم پر ہو:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الاحقاف ۴۶:۴)

''ان سے کہو کہ کبھی تم نے غور بھی کیا ان چیزوں پر جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو، مجھے دکھاؤ کہ زمین کی چیزوں میں سے انہوں نے کون سی چیز پیدا کی ہے یا ان کا آسمانوں میں کون سا ساجھا ہے! میرے سامنے اس سے پہلے کی کوئی کتاب پیش کرو یا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد علم پر ہو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔''

رہی یہ بات کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم ہے تو یہ بھی بالکل جھوٹ اور افتراء ہے، ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا ایک نمایاں کارنامہ تو ہجرت کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اللہ واحد کے لیے اپنے خاندان و وطن، سب کو چھوڑ دیا اور ہجرت کے وقت انہوں نے شرکاء و شفعاء سے جس طرح اپنی علیحدگی کا اعلان کیا اور براءت کا جو یادگار کلمہ کہا آج تک ان کی ذریت کی ایک شاخ، بنی اسرائیل میں اس کی روایت موجود ہے، جو ان کے تمام

اخلاف کے لیے ہمیشہ نشان راہ کا کام دے سکتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس استدلال اور قرآن کے جواب کی پوری تفصیل موجود ہے:

وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الزخرف ۴۳:۲۰-۲۸)

''اور کہتے ہیں کہ اگر خدائے رحمان چاہتا تو ہم ان کو پوجنے والے نہ بنتے، ان کو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے یہ محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں، کیا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی سند پکڑتے ہیں! بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہی کے نقش قدم پر راہ یاب ہیں، اور اسی طرح ہم نے جس بستی میں بھی تم سے پہلے کوئی منذر بھیجا تو اس کے خوش حالوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔ منذر نے کہا: کیا اگر میں اس سے زیادہ ہدایت بخش طریقہ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے جب بھی تم انہی کے نقش قدم کی پیروی کرو گے! انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس سارے کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو! تو ہم نے ان سے انتقام لیا تو دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں ان چیزوں سے بالکل بری ہوں جن کو تم پوجتے ہو، میں صرف اسی کو پوجتا ہوں جس نے مجھ کو پیدا کیا پس بے شک وہی میری رہنمائی فرمائے گا اور اس کو اس نے ایک پائدار روایت کی

حیثیت سے چھوڑا اپنے اخلاف میں تا کہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں۔"

ان آیات کے مطالب کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اہل عرب شرک کی حمایت میں جو روایات پیش کرتے تھے وہ بالکل بے بنیاد اور بے سروپا تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کی مدوّن سرگزشت، جس کو ایک علمی سند کی حیثیت دی جاسکتی تھی اور جو بنی اسرائیل کے صحیفوں میں موجود تھی، عربوں کے ان من گھڑت فسانوں کی تردید کے لیے بالکل کافی تھی، خصوصیت کے ساتھ ان کی ہجرت کا واقعہ تو توحید و اخلاص کا ایک یادگار کارنامہ تھا، لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ذریت ابراہیم کی دونوں شاخوں میں سے کسی نے بھی اس کلمہ باقیہ کی روح نہیں پہچانی، یہود اس نشان راہ کے باوجود بارہا بھٹکے اور بالآخر توحید کے صراط مستقیم سے وہ اس قدر دور ہو گئے کہ ان کے لیے اس کی طرف لوٹنا ناممکن ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی اور عربوں نے تو اپنی روایات کے دفتر سے سرے سے یہ سرگزشت ہی گم کر دی اور اس کے بالکل برعکس ایسی روایات گھڑ کے کھڑی کر دیں جن سے دین بت پرستی کی تائید نکلے۔

عربوں کے ان اوہام کی تردید میں قرآن نے جگہ جگہ حضرات ابراہیم علیہ السلام کے مختلف واقعات زندگی، نیز خانہ کعبہ کی تعمیر اور مقصد تعمیر کی ابتدائی تاریخ کا اور تمام انبیاء کرام کی دعوت کے مشترک مقصود کا حوالہ دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے تمہارے اس دعوے کی تائید نکلتی ہو کہ خدا نے شرک و بت پرستی کا حکم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا ذریعہ انبیاء ہیں اور انبیاء کی دعوتیں اگلے صحیفوں میں موجود ہیں ان میں سے کسی کی دعوت کو بھی تم شرک کی حمایت میں نہیں پیش کر سکتے۔ انبیاء کی تاریخ کا مدوّن سرمایہ قرآن کے دعوے کی تصدیق کر رہا ہے اور جہاں کہیں اس تاریخ میں کوئی بات ملائی گئی ہے اس کی تردید خود اسی کے اندر موجود ہے۔

۲۔ لوازم سے استدلال

قرآن کے استدلال خصوصی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہل عرب خدا کی جن صفتوں کو تسلیم

کرتے تھے، قرآن نے ان کے لوازم کو بھی تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا، یہ لوازم دو طرح کے ہیں، ایک وہ صفات جو ان مانی ہوئی صفات سے متفرع ہوتی ہیں، نیز ان صفات کی نفی جن سے مانی ہوئی صفات کی نفی لازم آتی ہے دوسرے وہ حقوق و فرائض جو ان صفات کے اقرار سے لازمی نتیجہ کے طور پر اقرار کرنے والے پر عائد ہوتے ہیں، اسی طرح ان اعمال و عقائد کی نفی جن سے خدا کے مسلمہ حقوق کی نفی لازم آتی ہے۔

اہل عرب کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وہ نہ صرف خدا کے وجود کے قائل تھے، بلکہ آسمانوں اور زمین کا خالق، روزی رساں، قویٰ اور قابلیتوں کا بخشنے، موت اور زندگی کا مالک اور مدبر امر خدا ہی کو مانتے تھے، لیکن رب یعنی مالک و حاکم خدا کے سوا اوروں کو بھی قرار دیتے تھے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ جس کے لیے یہ ساری صفتیں تسلیم کرتے ہو لازم ہے کہ رب بھی اس کو مانو:

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ

(یونس ۱۰:۳۲)

''پس وہی اللہ تمہارا رب حقیقی ہے تو حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے تو کہاں تمہاری عقل الٹ جاتی ہے۔''

یعنی یہ ساری باتیں مان لینے کے کے بعد تو یہ لازم ہے کہ مالک و حاکم اور آمر و ناہی اسی کو مانو، اس حق کے بعد، جو ثابت ہے، اگر کسی اور کو بھی مانتے ہو جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو یہ بھی ضلالت و گمراہی ہے چنانچہ سورۂ اعراف میں فرمایا کہ جس کو خالق ارض و سما مانتے ہو لازم ہے کہ اسی کو رب بھی مانو۔ اس کے سوا کسی اور مالک و حاکم نہ بناؤ جو خالق ہے امر و حکم کا حق اسی کو پہنچتا ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ..... اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ۭ

(الاعراف ۷:۵۴)

''بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا..... آگاہ کہ خلق اور

امر اسی کے لیے خاص ہے۔''

جس اللہ کو آسمان و زمین کا خالق مانتے ہو، اسی کو رب بھی مانو، یہ نہیں ہوسکتا کہ خالق کوئی ہو اور رب کوئی بن جائے، جس نے خلق کیا ہے امر اسی کا حق ہے جب ایک جزیرہ کا انکشاف کرنے والا اور ایک چیز کا ایجاد کرنے والا محض اپنے کشف و ایجاد کی بدولت یہ حق رکھتا ہے کہ اس کی ملکیت اور اس پر تصرف کا حق اسے حاصل ہو تو خدا کے اس حق سے کیوں انکار کرتے ہو، درآنحالیکہ اس کا حق کشف و ایجاد سے بدرجہا زیادہ ہے!

اسی طرح خالق کے لیے صفت علم کو لازم قرار دیا، یعنی جس ذات کو آسمان و زمین کا خالق مانتے ہو لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط کل مانو: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ (الملک ۶۷: ۱۴) (کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے)۔

اسی طرح یہ لازم ہے کہ جس خدا کو خلق و تدبیر پر قادر مانا ہے تمام نفع و ضرر اسی کے اختیار میں تسلیم کیا جائے: وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (الانعام ۶: ۱۷) (اور اگر اللہ تجھ کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کا دور کرنے والا بن سکے اور اگر کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

اسی طرح تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے بری قرار دیا گیا جو الوہیت کے منافی ہیں یا جن کو تسلیم کرنے سے ان صفات کی نفی لازم آتی تھی جن کو اہل عرب خدا کے لیے تسلیم کرتے تھے، یہ باب نہایت وسیع ہے اور اس پر ایک حد تک ہم ''حقیقت شرک'' کے تحت بحث کر چکے ہیں، یہاں صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صرف اچھی صفتیں سزاوار ہیں، کوئی بری صفت الوہیت کے تصور کے منافی ہے، اس کائنات کا معمہ حل ہی ایک ایسی ذات کو ماننے سے ہوتا ہے جو تمام صفات جمال و کمال کی جامع ہے اگر اس کے ساتھ کوئی ایسی صفت لگا دی جائے جو جمال و کمال کے منافی ہو تو یہ حل شدہ معمہ پھر

معمہ بن کے رہ جاتا ہے اور اس کائنات پر وہی ظلمت پھر طاری ہو جاتی ہے جسے خدا کے صحیح تصور نے نکالا تھا:

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الاعراف ۷:۱۸۰)

''اور اللہ کے لیے تو صرف اچھی ہی صفتیں ہیں تو انہی سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کی صفات کے باب میں کج روی اختیار کر رہے ہیں وہ جو کچھ کر رہے ہیں عنقریب اس کا بدلہ پائیں گے۔''

اس ذیل میں سب سے زیادہ اہمیت شرکاء وشفعاء کے اعتقاد کو حاصل ہے، اس عقیدہ سے خدا کی تمام اصولی صفات کی نفی ہو جاتی ہے، قرآن نے ان کے ان تناقضات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، مثلاً یہ کہ شفعاء کو ذریعہ تقرب بنانے سے لازم آتا ہے کہ خدا کا علم محیط نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کا علم محیط ہے تو یہ شفعاء اس کے علم میں کیا اضافہ کریں گے؟ اور اگر وہ اپنے علم کے خلاف محض ان کی سفارش کی بنا پر، لوگوں کو نیکوکار اور بدکار ٹھہرائے گا تو اس سے اس کے عدل وحکمت کی نفی لازم آتی ہے، اگر یہ خیال ہے کہ اس کی عنایت حاصل کرنے کے لیے تنہا عمل واطاعت کافی نہیں ہے، بلکہ کسی کا وسیلہ بھی ناگزیر ہے تو اس سے ہر بندہ کے ساتھ اس کی قربت، اس کی رحمت عام اور اس کے غفور وکریم ہونے کی نفی ہوتی ہے اور یہ ایک بدترین سوءظن ہے جس میں ایک بندہ اپنے پروردگار کے متعلق مبتلا ہو سکتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس کسی کو خدائی کے انتظام میں ساجھی ٹھہرانا یا تو خدا کے کمال قدرت کی نفی ہے یا کمال غیرت کی، کیونکہ کسی اور کی حصہ داری وہی خدا گوارا کر سکتا ہے جس کے لیے آسمان وزمین کا سنبھالنا مشکل ہو، یا پھر وہ بے غیرت ہو کہ اسے اپنے حدود وحقوق میں دوسروں کی مداخلت سے کوئی ننگ نہ لاحق ہو اور الوہیت کا تصور ان تمام عیوب ونقائص سے بالکل پاک ہے، قرآن نے جگہ جگہ عربوں کو ان تناقضات کی طرف توجہ دلائی ہے

اوران سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی ایسی صفت نہ مانیں جو خدائی کے برتر مفہوم سے بے جوڑ یا جس سے ان صفات کی نفی لازم آتی ہے جن کو وہ تسلیم کر چکے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ الزامی اور تنزیہی پہلو بالکل ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے ہیں اور انداز کلام عموماً مجادلہ کا نہیں، بلکہ ایک مسلمہ حقیقت کے بیان کا ہوتا ہے، کیونکہ ایک امر کے اقرار کے ساتھ اس کے لوازم کا اقرار اور اس کے اضداد کا انکار ایک امر بدیہی ہے جس سے صرف وہی لوگ گریز کر سکتے ہیں جو ہٹ دھرم ہوں۔

مندرجہ ذیل آیات پر مذکورہ بالا پہلو سے غور کرنا چاہیے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (البقرہ ۲:۱۱۶-۱۱۷)

"اور کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے اس کی شان ان باتوں سے ارفع ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے، سب اسی کے تابع فرمان ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کے لیے فرما دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔"

یہاں سُبْحٰنَهٗ (وہ پاک ہے) کا لفظ ایک دلیل کے طور پر آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لیے اولاد کا تصور الوہیت کے تصور کے منافی ہے، الوہیت کا تصور مقتضی ہے کہ وہ ہر طرح کی احتیاج اور ہر قسم کے کفوو برادری کی نسبت سے ارفع و منزہ ہو، وہ آسمان اور زمین کا موجد ہو، ان کو عدم سے وجود میں لایا ہو، اور اس کی قدرت کاملہ کا یہ حال ہو کہ جب چاہے مجرد اپنے حکم سے جس چیز کو چاہے وجود میں لا دے۔ ایک ایسی ہی ذات خدا ہو سکتی ہے اور تم کو خدا کے لیے ان صفات سے انکار نہیں ہے، لیکن ان کے ساتھ تم بعض ایسی صفتیں بھی مان لیتے ہو جو ان سے بالکل متناقض ہیں، جو نہ تو مفہوم الوہیت کے شایان شان ہیں اور نہ تمہاری مانی ہوئی صفتوں کے ساتھ وہ کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ؕ (یونس ۱۰:۶۸)

''یہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے وہ ایسی باتوں سے پاک ہے وہ بے نیاز ہے اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے، تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔''

ایک اوثان واصنام کے ضعف و بے چارگی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ الوہیت کے تصور کی یہ انتہائی تحقیر ہے کہ ایسے بے بس وجودوں کو اس خدا کا دست و باز وقرار دو جس کو قوی وعزیز مانتے ہو اور جس کی قوت وعزت کی سب سے بڑی شہادت یہ کائنات ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (الحج ۲۲:۷۳-۷۴)

''اے لوگو! یک تمثیل بیان کی جاتی ہے تو اس کو توجہ سے سنو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اگر چہ وہ اس کے لیے سب مل کر کوشش کریں، اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے، طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتوان! انہوں نے اللہ کی، جیسا کہ اس کا حق ہے، قدر نہیں پہچانی! بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔''

ایک جامع مثال ملاحظہ ہو جس میں توحید کی مختلف الزامی، تنزیہی، آفاقی اور نفسی دلیلیں ایک ہی سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں۔

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ

مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۚ وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْۤا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ (الزمر ۳۹:۳-۸)

''اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کریں، اللہ ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں، اللہ ان لوگوں کو بامراد نہیں کرے گا جو جھوٹے ناشکرے ہیں، اگر اللہ اولاد ہی بنانے کا ارادہ کرتا تو وہ چھانٹ لیتا ان چیزوں میں سے جو وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا، وہ پاک اور ارفع ہے وہ اللہ واحد ہے، سب پر قابو رکھنے والا، اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور دن کو رات پر اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، ہر ایک وقت مقرر کی پابندی کے ساتھ گردش کر رہا ہے، سن رکھو کہ غالب اور بخشنے والا وہی ہے اسی نے پیدا کیا تم کو ایک ہی جان سے، پھر پیدا کیا اسی کی جنس سے اس کا جوڑا اور تمہارے لیے (نر و مادہ) چوپایوں کی آٹھ قسمیں اتاریں، وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے، ایک خلقت کے بعد

دوسری خلقت میں، تین تاریکیوں کے اندر وہی اللہ تمہارا رب ہے، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تم کہاں بھٹکا دیے جاتے ہو! اگر تم ناشکری کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے، اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری کا رویہ پسند نہیں کرتا اور اگر تم اس کے شکر گزار ہو گے تو اس کو پسند کرے گا، اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔ پھر تمہارے رب ہی کی طرف تمہاری واپسی ہے تو وہ تمہیں ان کاموں سے آگاہ کرے گا جو تم کرتے رہے ہو، وہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے اور جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے، اس کی طرف متوجہ ہو کر، پھر جب وہ اپنی طرف سے اس کو فضل بخش دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول جاتا ہے جس کے لیے پہلے پکارتا رہا تھا اور اللہ کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ اس کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کرے، کہہ دو اپنے کفر کے ساتھ کچھ دنوں بہرہ مند ہو لو، تم دوزخ والوں میں سے بننے والے ہو۔''

جو شخص ان آیات پر غور و تدبر کرے گا اس کے سامنے بالتدریج توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے مندرجہ ذیل پہلو آئیں گے:

(ا) جو لوگ کسی کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ جھوٹے اور ناشکرے ہیں ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خدا نے کسی کو اپنا شریک بنایا ہے اگر ہے تو اس کو پیش کریں، اس دلیل کی تفصیل باب کے شروع میں گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) یہ خیال کہ خدا کی بیٹیاں ہیں جو اس کے ہاں سفارشی ہوں گی، بالکل باطل ہے خدا کے لیے اولاد کا تصور ہی سرے سے غلط ہے خدا کو واحد اور قہار (کنٹرول (CONTROL) میں رکھنے والا) ہونا چاہیے، وہ ہر قسم کے احتیاج سے بالاتر ہے اس کو بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا ضرورت، پھر ستم یہ ہے کہ اہل عرب خدا کے لیے بیٹیاں مانتے تھے، حالانکہ خود بیٹیوں سے سخت نفرت کرتے تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوہری غلطی کر رہے تھے ایک یہ کہ خدا کے لیے اولاد تسلیم کر رہے تھے، دوسری یہ کہ اولاد میں سے بھی خدا کے حصہ میں وہ اولاد دیتے تھے، جس

سے نفرت کرتے تھے۔

(ج) عالم کی خلقت عبث نہیں ہوئی ہے، بلکہ ایک غایت کے ساتھ ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جزا کا ایک دن ضرور آنے والا ہے اور عدل کامل کا ظہور یقینی ہے اس تصور کے ساتھ شفاعت کا تصور نہیں جمع ہوسکتا، کیونکہ شفاعت کا تصور عالم کے با مقصد ہونے کی نفی کر دیتا ہے، شفاعت عدل کی نفی ہے۔

(د) اس کے بعد دلیل توافق اور دلیل تسخیر، جو اوپر بیان ہو چکی ہے، سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کائنات کا خالق عزیز وغفار ہے، ''عزیز'' یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر، کوئی نہیں ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کے ہاں ایک لفظ بول سکے۔ ''غفار'' یعنی بخشنے والا اور گناہوں پر پردہ ڈالنے والا، اس لیے اس کے ہاں کسی سفارشی کی ضرورت نہیں ہے، آدمی کا اپنا عمل خود سفارشی ہے۔

(ہ) اس کے بعد خلقت اور ربوبیت کے دلائل سے اپنے علم کے احاطہ پر استدلال کیا اور پھر نتیجہ نکالا کہ جس نے پیدا کیا، جس نے پرورش کے وسائل مہیا کیے، جو ماؤں کے پیٹوں کے اندر، تہ بہ تہ پردوں کے پیچھے اپنی کاریگری کے کرشمے دکھاتا ہے وہ خدا مستحق ہے اس بات کا کہ اس کو رب مانو، اسی کے ہاتھ میں آسمان اور زمین کی بادشاہی ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے، نہ ہونا چاہیے۔

(و) اس کے بعد قانون عدل بیان کر کے شفاعت کی ساری توقعات کی بنیاد ڈھا دی کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے نہ کفر کو پسند کرتا ہے، نہ شکر کو ناپسند، تو جو شخص چاہے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن کر اس کی رضا اور قرب حاصل کرے، اور جو چاہے ناشکری کر کے اس کے قہر وغضب میں اپنے تئیں مبتلا کر لے، ان دونوں باتوں کا انحصار آدمی کے کے اپنے عمل پر ہے، کوئی دوسرا نہ شکر کو کفر بنا سکتا، نہ کفر کو شکر وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (الانعام ۶: ۱۶۴)

(ز) اس کے بعد اپنے احاطہ علم کو بیان کر کے شفاعت کی ضرورت کی نفی کر دی کہ وہ دلوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے، کوئی دوسرا اس کے علم میں کیا اضافہ کرے گا،

(ح) آخر میں توحید کی وہ دلیل بیان کی ہے جو دلیل افتقار کے عنوان سے ہم دلائل انفس کے تحت بیان کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام لوازم اور تمام تر تنزیہات کے بعد خدا کا تصور جس شکل میں سامنے آیا اس کی ایک عمدہ مثال آیت الکرسی ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (البقرہ ۲:۲۵۵)

''اللہ ہی معبود، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ زندہ ہے، سب کا قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں اور وہ بلند اور عظیم ہے۔''

دوسری نہایت عمدہ اور جامع مثال سورۂ حشر میں ہے وہ اس میں تنزیہہ کی جگہ اثبات کا پہلو غالب ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ

الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الحشر ۵۹:۲۲-۲۴)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب وحاضر کا جاننے والا، وہ رحمان ورحیم ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سکھ، امن بخش، معتمد، غالب، زور آور، صاحب کبریاء۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا، اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں۔ اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب وحکیم ہے۔''

اسی ذیل میں سورۂ اخلاص کو بھی سامنے رکھنا چاہیے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۙ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ﴿۴﴾ (الاخلاص ۱۱۲:۱-۴)

''کہہ دو، وہ اللہ سب سے الگ ہے، اللہ سب کے ساتھ ہے نہ وہ کسی کا باپ اور نہ کسی بیٹا اور نہ کوئی اس کا کفو۔''

خدا کا یہ تصور ان مسلمات کی اساس پر آراستہ ہوا جن کا اہل عرب کو اقرار تھا، قرآن نے یہ کہا کہ جن صفتوں کو اہل عرب مانتے تھے، ان کے لوازم کو بھی اس نے ان کے سامنے رکھ دیا کہ ان کو بھی تسلیم کرو، علی ہذا القیاس جن باتوں سے ان مسلمات یا ان کے لوازم کی نفی لازم آتی تھی، مطالبہ کیا ان کا انکار کرو۔

اسی طرح ان صفات کو تسلیم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق عائد ہوتے تھے ان کو بھی بلا شرکت غیرے تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔

سورۂ اعراف میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ جس نے خلق کیا ہے لازماً وہی رب ہے اور امر وحکم کا حق اسی کو حاصل ہے یہ نتیجہ نکالا کہ خفیہ وعلانیہ اور امید وبیم، ہر حال میں اسی کو پکارنا چاہیے، مشکلوں کو آسان کرنے والا، خطرات ومصائب کا دور کرنے والا اور امیدوں کو

پورا کرنے والا وہی ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (الاعراف ۷:۵۵) (اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے) وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (الاعراف ۷:۵۶) (اور اسی کو پکارو بیم ورجا دونوں حالتوں میں)۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ جس کو خالق مانتے ہو اسی کی بندگی اور اطاعت بھی کرو، دوسروں کو اس بندگی اور اطاعت میں شریک نہ کرو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرہ ۲:۱۲)

''اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔''

اسی بندگی کے لیے جگہ جگہ یہ شرط لگائی کہ خالص اطاعت کے ساتھ اس کی بندگی کرو مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (الاعراف ۷:۲۹) یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ پوجا خدا کی ہو اور اطاعت کسی اور کی لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (المؤمن ۴۰:۶۵) (اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو پکارو، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ)۔

اسی طرح فرمایا کہ جس رب کے لیے آسمان وزمین کی بادشاہی ثابت ہے، حمد وشکر کا سزاوار صرف وہی ہے لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (التغابن ۶۴:۱) (اسی کی بادشاہی ہے اور وہی سزاوار شکر ہے)۔

سورۂ بقرہ ہی میں خدا کو منعم حقیقی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی کو محبت حقیقی کا مرکز ہونا چاہیے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ ۲:۱۶۵) (اور جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں)۔ پھر اسی ذیل میں فرمایا کہ جب سب کچھ خدا ہی کی بخشش سے ملا ہے تو صرف خدا ہی کو ان کے حرام یا حلال کرنے کا حق حاصل ہے، دوسروں کے لیے ان کو حلال وحرام کرنے کا حق تسلیم کرنا یا دوسروں کا ان کو حلال وحرام کرنا شرک ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ اِنَّ فِيْ خَلْقِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي
الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ
اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا
مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ
يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى
اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۲: ۱۶۳-۱۶۹)

''اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ رحمان اور رحیم ہے، بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت رات اور دن کی آمد و شد، اور کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں، جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے، لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب کہ یہ

عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے اس وقت کا خیال کرو جب کہ مقتدا اپنے پیروؤں سے اظہار براءت کریں گے، اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے، اور ان کے تعلقات یک قلم ٹوٹ جائیں گے اور ان کے پیرو بھی کہیں گے کہ اے کاش! ہمیں دنیا میں ایک بار اور جانا نصیب ہوتا کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہار براءت کر سکتے جس طرح انہوں نے ہم سے اظہار براءت کیا ہے! اس طرح اللہ ان کے اعمال ان کو سرمایہ حسرت بنا کر دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا، اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، وہ تو بس تمہیں برائی اور بے حیائی کی راہ سوجھائے گا اور اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔''

سورۂ نحل میں آسمان و زمین میں ایک ہی خدا کا تصرف ثابت کرنے کے بعد اس کا لازمی نتیجہ یہ قرار دیا کہ ''فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ'' (النحل ۱۶:۵۱) (تو مجھی سے ڈرو) اور غیر اللہ سے ڈرنے پر تعجب کا اظہار فرمایا: اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ (النحل ۱۶:۵۲) (تو کیا تم غیر اللہ سے ڈرتے ہو)۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآىِٕلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ یَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا یَعْلَمُوْنَ نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَ لَهُمْ مَّا یَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ

مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (النحل ۱۶:۵۸-۵۹)

''کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ہے ان کے سائے دہنے اور بائیں سے منقلب ہوتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اور ان پر فروتنی ہوتی ہے اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں جاندار ہیں اور فرشتے بھی، وہ سرتابی نہیں کرتے، وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے اور اللہ نے فرمایا کہ دو معبود نہ بنانا، وہ ایک ہی معبود ہے تو مجھی سے ڈرو، اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے تو کیا تم غیر اللہ سے ڈرتے ہو، اور تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم فریاد کرتے ہو، پھر جب وہ تم سے تکلیف دور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کا شریک ٹھہرانے لگتا ہے تاکہ ناشکری کریں اس چیز کی جو ہم نے ان کو بخشی ہے تو چند روزہ عیش کر لو، عنقریب تم جان لو گے اور جن کے بارے میں انہیں کوئی علم نہیں ان کا حصہ لگاتے ہیں ان چیزوں میں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں۔ خدا کی قسم! جو افتراء تم کر رہے ہو اس کی تم سے پرسش ہونی ہے اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ ان چیزوں سے پاک ہے، اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہیں اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے، اور وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے وہ اس منحوس خبر پر لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے، سوچتا ہے کہ اس کو ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اس کو مٹی میں دفن کر دے، افسوس! کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔''

سورۂ انعام میں فرمایا کہ جو آسمان و زمین کا فاطر ہے لازم ہے کہ اسی کو یا ور و ناصر بنایا جائے اور اپنے تئیں بالکلیہ اسی کے حوالے کیا جائے:

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ (الانعام ۶:۱۴)

''کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں اور وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں، کہہ دو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں۔''

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ کو ہادی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے:

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (یونس ۱۰:۳۵)

''پوچھو، کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو، کہہ دو، اللہ ہی ہے جو حق کی توفیق بخشتا ہے تو کیا جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ پیروی کیے جانے کا مستحق ہے یا وہ جو بغیر رہنمائی کے خود راہ نہیں پاتے؟ تو تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟''

سورۂ فاتحہ میں عالم کے رب ہی کا حق یہ بتایا کہ شکر اسی کے لیے ہو، بندگی اسی کی کی جائے، استعانت اسی سے ہو:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (الفاتحہ ۱:۴)

''ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

الغرض جو شخص خدا کو ایک مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خدا کے حقوق میں کسی نوعیت سے کسی دوسرے کو شریک کر کے اس کی صفات کی نفی یا اس کے حقوق کا ابطال نہ کرے، مثلاً جو شخص خدا کو کھلے اور چھپے کا عالم مانتا ہے وہ کسی کو شفیع و سفارشی مان کر اس کی صفت علم کی نفی نہ کرے، جو شخص خدا کو رحمان و رحیم مانتا ہے وہ شفاعت کو عقیدہ رکھ کر خدا کے عدل[1] سے بدگمان نہ ہو۔ جو خدا کو بادشاہ تسلیم کرتا ہے وہ اس کی بادشاہی میں کسی

---

[1] جس شفاعت کا عقیدہ مشرکین اپنے شفعاء کے متعلق رکھتے تھے اور جس سے خدا کی صفات کی شرکت اور اس کے علم اور عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے وہ شرک اور کفر ہے اور ہرگز جائز نہیں ہے کہ اس طرح کی شفاعت کا عقیدہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین کے متعلق رکھا جائے۔ قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ کسی کو بھی خدا کے ہاں تدلل کا مقام حاصل نہ ہوگا۔ سب اس کے سامنے عاجز و سرفگندہ کھڑے ہوں گے۔ نیز کوئی شخص بغیر اذن الٰہی کے اس کے

دوسرے کی اطاعت نہ کرے، جو خدا کو پاک و پاکیزہ جانتا ہے وہ پاکیزگی کو اس کے ہاں تقرب کا وسیلہ بنائے نہ کہ شرکاء و انداد کو۔ جو شخص خدا کو سلام یعنی سکھ اور چین تسلیم کرتا ہے وہ سکھ اور طمانیت اسی سے طلب کرے۔ جو اس کو امن دینے والا مانتا ہو وہ اسی کی پناہ میں چھپے، جو اس کو معتمد مانتا ہے وہ اسی پر بھروسہ کرے اور اسی سے طالب مدد ہو۔ جو اس کو غالب اور عالی جناب مانتا ہے وہ اسکے آگے سب کو یکساں عاجز و سرفگندہ مانے، جو اس کو غیور مانتا ہے لازم ہے کہ وہ کسی غیر کو سجدہ کر کے اس کی غیرت و کبریائی کو جوش نہ دلائے جو خدا ہی کو خالق، وجود بخشنے والا اور صورت گری کرنے والا مانتا ہے لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط اور اس کی قدرت کو کامل تسلیم کرے۔

۳۔ دلیل عدل

توحید کے انفسی دلائل کے سلسلہ میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور یہ عدل انسان کو ایک خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی پر مجبور کرتا ہے اس شعور عدل کو قرآن نے عہد فطرت سے تعبیر کیا ہے اور اس کی ذمہ داری ہر انسان پر عائد کی ہے، وہاں یہ دلیل عام دلیل کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی اور اس کی حجت اہل عرب اور تمام بنی آدم پر یکساں تھی۔ قرآن نے اسی اصل سے بعض خاص دلیلیں بھی پیدا کیں جن کی ترکیب میں فطرت انسانی اور مسلمات عرب، دونوں شامل ہیں، مثلاً اہل عرب تمام عالم کا خالق اور روزی رساں خدا ہی کو مانتے تھے، لیکن رب اور حاکم دوسروں کو بھی بنا لیتے تھے اور پھر

حضور میں زبان نہ کھول سکے گا، نیز ایک حرف بھی حق کے خلاف نہ کہہ سکے گا اور کوئی شفاعت ایسی نہ ہوگی۔ جس سے حق، باطل اور باطل، حق بن جائے۔ پس انبیاء و صالحین اور ملائکہ سے جو شفاعت ثابت ہے وہ اس مشرکانہ شفاعت سے بالکل مختلف ہے اور اس پر مفصل بحث ان شاء اللہ ہم اپنی کتاب ''حقیقت معاد'' میں کریں گے اور بعض ضروری باتوں سے ''حقیقت رسالت'' میں بھی تعرض کریں گے۔

ان کا رتبہ اس قدر بڑھاتے کہ ان کو خدا کے برابر لے جا کر بٹھا دیتے، بلکہ بسا اوقات خود خدا سے بھی بڑھا دیتے، قرآن نے ان کے اس مسلمہ اور انسانی فطرت کی عدل پسندی کی بنا پر ان سے یہ سوال کیا کہ جب تم اپنے لیے نہیں پسند کرتے کہ اپنے غلاموں اور مملوکوں کو درجہ اور روزی میں اپنے برابر کا شریک قرار دو تو پھر جن کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے ہو ان کو خدا کے اختیارات اور خدا کے حقوق میں کیوں شریک کرتے ہو؟ تمہاری فطرت جس بات سے اپنے لیے انکار کرتی ہے اسی چیز کو اللہ جل شانہ کے لیے کس طرح گوارا کر لیتی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ تھا کہ خدا کے بارہ میں تم اس سے کہیں زیادہ نفرت کرتے، اس اصل کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے۔ ان میں یہ دلیل مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے:

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (النحل ۱۶:۷۱-۷۶)

''اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق کے معاملہ میں برتری دے رکھی ہے تو جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو نہیں دے دیتے کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں تو کیا وہ اللہ کے فضل کا انکار کرتے ہیں اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا، تو کیا یہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا ان چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ ان کے لیے آسمان سے کسی رزق پر اختیار رکھتی ہیں، نہ زمین سے اور نہ وہ اس کی استطاعت ہی رکھتی ہیں، تو تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے اور اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا اور اس کی جس کو ہم نے اپنی جانب سے اچھا رزق دے رکھا ہے جس میں سے وہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے، کیا یہ یکساں ہوں گے؟ شکر کا سزاوار اللہ ہے، لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے اور اللہ مثال بیان کرتا ہے دو شخصوں کی جن میں سے ایک گونگا ہے، جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، جہاں کہیں بھی وہ اس کو بھیجتا ہے وہ کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا کیا وہ اور وہ جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ ایک سیدھی راہ پر ہے، دونوں یکساں ہوں گے؟''

یہی اساس استدلال سورۂ نجم کی اس آیت میں ہے:

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (النجم ۵۳:۲۱-۲۲)

''تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اس کے لیے بیٹیاں! یہ تو بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی!''

۴۔ اہل کتاب اور منافقین:

یہود و نصاریٰ اور منافقین، جیسا کہ ہم ''حقیقت شرک'' میں بیان کر چکے ہیں، بالعموم یا تو خدا کی صفات سے صحیح تصور میں بھٹکے تھے یا ان سے متناقض چیزیں مانتے تھے یا ان صفات کے لوازم کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے، اس وجہ سے وہ عمومی دلائل کی جگہ خصوصی دلائل کے مخاطب ہیں ان کے سامنے ان کے مسلمات رکھ دیے گئے ہیں اور ان سے مطالبہ کیا گیا

ہے کہ جو باتیں ان سے متناقض انہوں نے مان رکھی ہیں ان کو ترک کریں، اور جو باتیں ان سے لازم آتی ہیں، ان کو تسلیم کریں، ان کے سامنے توحید کی حقیقت جس طرح پیش کی گئی ہے اس کی تفصیل ہم ''حقیقت شرک'' میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے محض استدلال کی نوعیت اور اس کی اساس واضح کرنے کے لیے چند باتوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

مثلاً اہل کتاب کے یہاں یہ چیز مسلم تھی کہ خدا کے سوا کوئی رب نہیں ہے قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر یہ بات مانتے ہو تو مسیح علیہ السلام اور احبار و رہبان کو رب نہ بناؤ اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ کسی کے لیے آمر و نہی کا مطلق حق تسلیم کر لینا در حقیقت اس کو رب بنا لینا ہے، زبان سے اس کو رب کہو یا نہ کہو۔ اسی طرح یہود کو اپنی نسبت یہ گمان تھا کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اور بندگی سے کچھ مافوق درجہ رکھتے ہیں قرآن نے ان کی اس تاریخ سے، جس کو وہ مانتے تھے، ان پر ثابت کر دیا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی انہوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے باہر قدم نکالا ہے خدا نے ان کو نہایت عبرت انگیز سزائیں دی ہیں جو اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان کا درجہ بشریت سے کچھ اونچا نہیں ہے نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری سرگزشت ان کو سنا کر ان پر یہ حقیقت واضح فرمائی کہ ان کو خدا کے ہاں جو تقریب اور درجہ حاصل ہوا وہ بندگی اور اطاعت کا ثمرہ تھا تو انہی کی اولاد کو خدائی کا مقام کیسے حاصل ہو جائے گا؟

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی خارق عادت پیدائش کو ان کی الوہیت کے ثبوت میں پیش کیا تو قرآن نے ان کے مسلمات سے ان کے خلاف حجت پیش کی کہ تم آدم علیہ السلام اور یحیٰی علیہ السلام کی ولادت کو بھی خارق عادت مانتے ہو، لیکن ان کی الوہیت کے مدعی نہیں ہو؟ نیز حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا کھانا کھانا بھی ان کی بشریت کے ثبوت میں پیش کیا، کیونکہ کھانا کھانا بھی یہود و نصاریٰ کے ہاں

بشریت کی ایک مسلم دلیل تھی اور اسی دلیل سے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے بارہ میں اپنے شاگردوں کی ایک غلط فہمی دور کی تھی جس کی تفصیل ''حقیقت شرک'' میں گزر چکی ہے، نیز حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض اقوال کا جو غلط ترجمہ ہو گیا تھا قرآن نے اس کی تصحیح کر دی۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے انجیلوں میں بار بار یہ نقل ہوتا ہے: ''میرا باپ اور تمہارا باپ''۔ قرآن نے اس کی تعبیر رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ (میرا رب اور تمہارا رب) سے کی ہے اور یہ تعبیر انجیلوں کے دوسرے بیانات، نیز انجیلوں کی اصل زبان، یعنی عبرانی کے بالکل مطابق ہے۔

منافقین کی تمام ضلالت ان لوازم اور حقوق کے سمجھنے میں تھی جو خدا اور اس کی صفتوں پر ایمان لانے سے بندے پر عائد ہوتے ہیں اور اس ضلالت کا سبب یہ نہیں تھا کہ ان لوازم کے ادراک میں کوئی اشکال تھا یہ ساری باتیں بالکل واضح تھیں اگر ان میں کوئی اشکال تھا تو وہ قرآن کی بار بار کی وضاحت سے دور ہو گیا تھا، لیکن منافقین کی بیماری عقلی نہیں قلبی تھی، ان کے دلوں کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ توحید کے مقتضیات کا ساتھ دے سکتے، اس لیے اگر اس راستہ سے خدا کے دین میں داخل ہوتے تھے تو دوسرے راستوں سے بھاگ کھڑے ہونے کے لیے تیار رہتے تھے ان کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے قرآن نے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ان کرشموں کو بیان کیا جو مسلمانوں کی قلت وضعف کے باوجود ان کی فتح و کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوئے اور دوسری طرف توحید کے تمام گوشوں کی پوری پوری توضیح کی۔ چنانچہ تقریباً ان تمام سورتوں میں جن میں منافقین مخاطب ہیں، یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کائنات کی تمام چیزیں اللہ واحد کے آگے سرفگندہ اور اس کی حمد وتسبیح میں سرگرم ہیں تاکہ خدا کی حمد وتسبیح میں تمام کائنات کی اس ہم آہنگی کو دیکھ کر ان کے دلوں میں ہمت پیدا ہو اور اس خیال سے ان کے دل پست نہ ہوں کہ اس راہ پر چلنے والے تھوڑے ہیں بلکہ یہ دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھے کہ تھوڑے سے ناشکرے انسانوں کے سوا

ساری کائنات اس راہ میں سرگرم سفر ہے اور قافلوں سے بھری ہوئی سڑک یہی ہے جو بظاہر سنسان نظر آرہی ہے۔ قرآن میں جو لوگ مسبحات [1] کی روح سمجھ گئے ہیں ان کو ہمارے اشارات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

---

[1] مسبحات سے ہماری مراد وہ سورتیں ہیں جو ''سَبَّحَ'' اور ''یُسَبِّحُ'' سے شروع ہوتی ہیں، ان سورتوں میں بالعموم روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جنہوں نے زبان سے اقرار پوری توحید کا کرلیا تھا، لیکن اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے میں تھڑولے پن کا ثبوت دے رہے تھے اور مشرکین مکہ اور یہود کی جتھے بندی سے خائف تھے کہ ممکن ہے ان کی منظم طاقت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ان کی قلت تعداد کی وجہ سے پسپا ہونا پڑے تو تقاضائے مصلحت یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی رابطہ رکھا جائے اور یہود و مشرکین سے بھی ناتا نہ توڑا جائے۔ ان منافقین کے سامنے قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں خدا کی تسبیح کرتی ہیں، تسبیح کی اصل حقیقت ڈنڈوت اور جبیں سائی (PROSTRATION) ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا کی ساری چیزیں خدا کے بنائے ہوئے قانون کی مطیع و فرماں بردار ہیں اور سرمو اس کے حکم سے انحراف نہیں کر رہی ہیں اور اپنے عمل سے خلائق کو دعوت دے رہی ہیں کہ سب اسی کی اطاعت میں سرگرم ہوں۔ نیز کسی کو بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ کے فرماں برداروں کی تعداد تھوڑی ہے، بلکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے یعنی ساری کائنات خدا کی فرماں بردار اور مطیع ہے اس کی نافرمانی کرنے والے اگر ہیں تو بس انسانوں کے اندر ہیں، تو جو شخص خدا کی راہ میں قدم رکھے وہ یہ خیال نہ کرے کہ وہ تنہا ہے، بلکہ اسے یہ خیال کرنا چاہیے کہ تھوڑے سے بلید انسانوں کے سوا، جنہوں نے اپنے نفس کو یا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے، آسمان سے لے کر زمین تک ایک ایک ذرہ اس کے ہم رکاب ہے۔

باب ۴

پچھلے مباحث کا خلاصہ

اوپر کے تین ابواب میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ہم ان کا اجمالی خلاصہ بھی پیش کر دیتے ہیں تاکہ یہ پھیلے ہوئے مطالب بسہولت پڑھنے والوں کی گرفت میں آجائیں۔

(ا) ان تفصیلات سے پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کے استدلال کی ساری عمارت الزامی اور خطیبانہ قسم کی دلیلوں پر قائم ہے اور وہ ٹھوس عقلی وفطری دلائل سے بالکل خالی ہے، وہ قرآن کے متعلق نہایت مکروہ قسم کے سوءظن میں مبتلا ہیں۔ بلاشبہ قرآن مجید میں الزامی دلائل ہیں، لیکن یہ قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے اور اس کی مخاطب وہ جماعتیں ہیں جو بعض صحیح اصولوں کو تسلیم کرتی ہیں قرآن نے ان کے ان مسلمات سے ان پر حجت قائم کی ہے اور یہ استدلال کا ایک بالکل فطری اور عقلی طریقہ ہے جو تمام بنی آدم میں یکساں مسلم ہے باقی قرآن کے عام استدلال کی اساس فطرت اور کائنات کی آیات پر ہے جن کی حجت عربی وعجمی اور عامی وفلسفی سب کے لیے یکساں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن تمام بنی آدم کی ہدایت کے لیے نازل ہوا اور اب قیامت تک دنیا کی ہدایت ورہنمائی کے لیے کافی ہے۔

(ب) دوسری حقیقت یہ ثابت ہوئی کہ قرآنی استدلال ہمارے متکلمین وفلاسفہ کے استدلال سے بالکل مختلف ہے ان کی ساری کاوش کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ صرف ایک علتہ العلل کا اثبات ہے جس سے نہ تو اس کائنات کا معمہ ہی حل ہوتا اور نہ وہ خلا ہی بھرتا جس کو ہر انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور جس کو بھرنے کی اس کے اندر اتنی شدید خواہش ہے کہ

بسا اوقات اگر وہ صحیح چیز نہیں پاتا تو کسی غلط ہی چیز سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے اس کے برعکس قرآنی استدلال سے ایک ایسے خدا کا ثبوت ملتا ہے جو تمام اچھی صفتوں سے متصف ہے جس نے اپنے ارادہ سے دنیا کو پیدا کیا ہے اور حکمت و رحمت کے ساتھ دنیا کی تدبیر و پرورش فرما رہا ہے یہ نہیں ہے کہ جس طرح سورج سے بالاضطرار خلق کو فائدہ پہنچ رہا ہے اسی طرح خدا سے یہ دنیا بالاضطرار وجود میں آ گئی اور اس سے اضطراراً فیض پا رہی ہے، نیز یہ بھی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو خلق کر کے اس کے روزمرہ معاملات سے بے تعلق ہو گیا ہو، یہاں تک کہ اگر وہ غائب ہو جائے تو اس کے غائب ہو جانے سے دنیا کو کوئی نقصان نہ پہنچے، جیسا کہ یونانی فلسفیوں کا خیال تھا، بلکہ وہ تمام عالم کے تدبیر و نظام پر حاوی اور مسلط ہے، اس کا علم جزئیات اور کلیات کو یکساں محیط ہے، زمین کے اندر جو کچھ داخل ہوتا ہے اور آسمان کے اوپر سے جو اترتا ہے وہ سب کو جانتا ہے تمام خیر و شر اس کے ہاتھ میں ہے روشنی اور تاریکی، دونوں کا نکالنے والا وہی ہے، اس کے اذن کے بغیر نہ ایک ذرہ اپنی جگہ سے ٹل سکتا نہ ایک پتہ اپنی شاخ سے گر سکتا، نیز وہ بے ہمہ اور باہمہ ہے جب کچھ نہیں تھا، تب وہ تھا اور جب کچھ نہ ہوگا تب بھی وہ ہوگا، وہ خالق ہے، باری ہے، مصور ہے، رزاق ہے، علیم و قدیر ہے، رحمٰن و رحیم ہے، عزیز و حکیم ہے، غالب و قہار ہے، مومن و مہیمن ہے، غفار و ستار ہے، قدوس و سلام ہے، ملک اور رب ہے، غفور و ودود ہے، ہادی و کریم ہے۔ وہ سب سے مستغنی اور سب کی پناہ ہے، نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا ہے، نہ کوئی اس کی ذات برادری کا ہے۔

(ج) تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خدا کی ان صفتوں کے لوازم ہیں اور جس طرح وہ اپنی صفات میں یکتا اور بے شریک ہے اسی طرح ان لوازم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے مثلاً یہ کہ جب وہ خالق ہے تو اسی کو رب مانا جائے، اسی کے امر و حکم کی پیروی کی جائے، زندگی کے ہر مرحلہ میں اسی کی اطاعت و بندگی ہو جب وہی رزاق ہے تو حقیقی شکر گزاری اور حقیقی محبت کا مرکز وہی ہے اور ساری شکر گزاریاں اور ساری محبتیں اس کی شکر گزاری اور محبت کے تابع ہیں جب وہ مومن و مہیمن ہے تو اسی پر توکل کیا جائے، اسی سے استعانت ہو،

اسی سے فریاد کی جائے جب وہ عزیز و حکیم ہے تو حقیقی اعتماد کے لائق وہی ہے اور لازم ہے کہ رنج و راحت، دکھ، سکھ، ہر حال میں اسی پر بھروسہ کیا جائے۔ جب وہ علیم و قدیر ہے تو تمام سر و علانیہ کو اس پر آشکارا مانا جائے، جب وہ ہادی ہے تو واجب ہے کہ اسی کی ہدایت کی پیروی کی جائے، نیز یہ بھی ضروری ہوا کہ ان تمام باتوں سے قول و فعل میں اجتناب کیا جائے جن سے ان لوازم کی نفی لازم آئے یا ان میں دوسروں کی حصہ داری ثابت ہو۔

رہا یہ سوال کہ خدا کی مرضی اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اس کے احکام کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے تاکہ انسان اس کی توحید کا پورا حق ادا کر سکے اور غیر اللہ کی اطاعت سے آلودہ نہ ہو تو اس پر تفصیل کے ساتھ ہم اپنی کتاب ''حقیقت رسالت'' میں بحث کریں گے۔[1] یہاں اس سوال سے تعرض کا موقع نہیں ہے یہاں تک ہم نے جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ کائنات اور فطرت انسانی کی کھلی ہوئی شہادت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مدبر ہے جو تمام صفات حسنٰی سے متصف ہے اور اس کائنات پر آمر و متصرف ہے وہی ہمارا مولیٰ اور رب ہے جس کی عبادت اور اطاعت ہم پر واجب ہے وہی ہماری تمام شکر گزاریوں، تمام نیازمندیوں اور تمام التجاؤں کا مرکز ہے۔

لا الٰه الّا هو ولا رب سواه۔

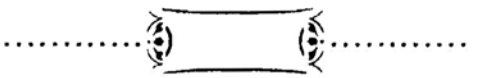

---

[1] افسوس کہ یہ کتاب نہ میں اب تک لکھ سکا اور نہ اب بظاہر اس کی توقع ہے۔

باب ۵

توحید کے اثرات

پچھلے ابواب میں توحید کی جو حقیقت پیش کی گئی اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ توحید مجرد ایک علمی حقیقت نہیں، بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت ہے انسانی زندگی پر خواہ انفرادی ہو یا جماعتی، اس کے نہایت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

انفرادی زندگی پر اس کا سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ یہی عقیدہ انسان کو آزادی وحریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا، وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے، مستحق ہے، تمام کائنات انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے، لیکن جب تک انسان توحید سے آشنا نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی دناءت ورذالت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی حقیر سے حقیر چیزوں سے ڈرتا اور کانپتا ہے، جو چیزیں اس کی تابعداری اور اطاعت کے لیے پیدا ہوئی ہیں وہ خود ان کی تابعداری اور اطاعت کرتا ہے، اپنے ہی جیسے انسان کو اپنا رب اور آقا بناتا ہے، غلاموں کی طرح ان کے آگے جھکتا ہے، ان کو ان داتا، خداوند نعمت، غریب پرور وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتا ہے، ان کے لیے ہر طرح کے امر ونہی کا حق تسلیم کرتا ہے یہاں تک کہ زندوں سے گزر کر مردوں کی قبروں پر بھی اپنی درخواستیں اور التجائیں پیش کرتا ہے ان کو امور کائنات میں مصرف، عالم الغیب اور نافع وضار سمجھتا ہے، بالآخر ہر چکنے پتھر اور ہر اونچے درخت کو معبود بنالیتا ہے اور ہر گھنی جھاڑی، ہر سنسان مقام، ہر بہتا دریا، ہر اونچا پہاڑ او ہر ضرر رساں قوت اور نفع بخش طاقت اس کو بندگی کی دعوت دیتی ہے اور ان میں سے کسی کے سامنے بھی اس کو اپنے نفس کو ذلیل کرنے میں کوئی غیرت نہیں لاحق ہوتی، وہ ایک مرتبہ اپنے مقام عزت سے گر کر برابر گرتا ہی چلا جاتا ہے اور اس شرف کو بالکل کھو دیتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز کیا تھا یہی حقیقت ہے جو سورۂ حج کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے:

وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (الحج ۲۲:۳۱)

''اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔''

جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت گزاری میں لگایا وہ اس کی خدمت گزار ہونے کے باوجود ننگ گوارنہیں کرتیں کہ اس کو سجدہ کریں، ان کا سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، لیکن انسانوں کی دناءت کا یہ عالم ہے کہ ان سب کا مقصود ہونے کے باوجود ان میں سے ہر ایک در کا نقش سجدہ اس کی پیشانی پر ثبت ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۱۸﴾ (الحج ۲۲:۱۸)

''کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے آگے جھکتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین ہیں اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور لوگوں میں سے بہتیرے اور بہتیرے ایسے ہیں جن پر خدا کا عذاب لازم ہو چکا ہے اور جن کو خدا ذلیل کر دے تو ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک اللہ ہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

لیکن توحید کا چمکارا پاتے ہی دفعتہً اس کی حالت میں ایسا انقلاب عظیم واقع ہو جاتا ہے کہ وہی انسان جس کو ہم نے اس حال میں دیکھا تھا کہ وہ اس دینا کی ہر چیز سے نیچے تھا اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز اس سے نیچے آجاتی ہے، اس تغیر حال کی بہترین مثال ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے مقابلہ کرنیوالے ساحروں کی سرگزشت میں ملتی ہے جن جادوگروں کو فرعون نے اکٹھا کیا تھا گھڑی بھر پہلے ان کی دناءت طبع کا یہ حال تھا کہ میدان مقابلہ میں اترنے سے پہلے اپنی مزدوری کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتے ہیں اور نہایت ذلیل خوشامدانہ انداز میں التجا کرتے ہیں: اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ

الْغٰلِبِيْنَ (الشعراء ۲۶:۴۱) (کیا ہمارے لیے کوئی صلہ بھی ہے اگر ہم ہی غالب رہنے والے ہوئے!) لیکن زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ توحید کا ایک پرتو پڑتے ہی ان کی طبیعت میں ایسا تغیر عظیم رونما ہو جاتا ہے کہ فرعون ان کو ایمان لانے پر سخت سے سخت سزا کی دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تم کو سولی پر لٹکا دوں گا، لیکن ان پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ بے دھڑک جواب دیتے ہیں: کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے پاس ہی جائیں گے، تمہیں جو کچھ کرنا ہے کرلو، تمہارا زور بس اسی دنیا کی زندگی پر چل سکتا ہے:

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (الاعراف ۷:۱۲۶)

''تم ہمارے درپے آزار صرف اس غصہ میں ہو رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے، اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں وفات اسلام پر دے۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک موحد پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ دکھ ہو یا سکھ، زندگی ہو یا موت، ہر ایک کے آنے اور جانے کا راستہ ایک ہی ہے پس وہ امید و بیم، ہر حال میں ایک ہی سے امید رکھتا ہے اور اسی سے ڈرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا مختلف دیوتاؤں اور کارفرماؤں کی رزم گاہ نہیں ہے، ایک ہی عزیز و حکیم ہے جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور ممکن نہیں کہ اس کی مشیت کے خلاف اس عالم کے معاملات میں کوئی ایک ذرہ برابر دخل دے سکے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عالم کا خالق حق اور محبّ حق ہے، اس وجہ سے اس عالم میں باطل مجرد کا وجود نہیں، باطل کی حیثیت اس دنیا میں طفیلی کی ہے جو حق کے ساتھ لگ جاتا ہے اور بالواسطہ وہ بھی حق ہی کی خدمت کرتا ہے جس پر یہ راز کھل گیا اس نے دنیا جہان کی دولت پالی، اس کا خزانہ لازوال اور اس کی زندگی غیر فانی ہے، وہ نہ تو کبھی ہراساں ہوتا نہ کبھی اس کو تنہائی دکھ دیتی، وہ ایک سدا بہار درخت سے کھاتا اور ایک ہمیشہ جاری رہنے والے چشمے سے آسودہ حال رہتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ

فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِيٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (ابراہیم ۱۴: ۲۴-۲۵)

''کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمہ طیبہ کی وہ شجر طیبہ کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔''

یہی لوگ ہیں جن کا دماغ مصیبت و راحت، ہر حال میں متوازن رہتا ہے اور تنگی وفراخی کی کوئی حالت ان کے دل کے اطمینان کو درہم برہم نہیں کرتی، نہ وہ گھبراتے نہ مایوس ہوتے نہ اکڑتے اور نہ فخر کرتے، جس خندہ جبینی کے ساتھ وہ آرام کی گھڑیوں کا استقبال کرتے ہیں اسی شادمانی کے ساتھ آزمائشوں اور مصیبتوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

(الفجر ۸۹: ۲۷-۲۸)

''اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جما رہا، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔''

یہ ایک موحد کا باطن ہے وہ اپنے باطن میں بالکل یکسو اور حنیف ہو جاتا ہے اور پھر یہی یکسوئی اور حنیفیت اس کے ظاہر پر بھی طاری ہو جاتی ہے، وہ جس طرح قوانین طبیعی کے آگے بے بس اور مسلوب الاختیار ہوتا ہے وہی بے بسی اور مسلوب الاختیاری وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کے آگے اختیار کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو آزادی بخشی ہے اپنی خوشی سے اللہ کی مرضی کے ماتحت کر دیتا ہے سورج اور چاند، ابر و ہوا، دریا اور پہاڑ مجبورانہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں، یہ مہاروں میں بندھی ہوئی اونٹنیوں کے مانند اپنے متعین راستوں پر چلتے ہیں، لیکن مومن انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ناکوں میں نکیل ڈال کر اس قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے اور یہی انسان کا اصلی شرف ہے یہی اختیاری انقیاد و اطاعت توحید کی اصلی روح ہے اور جو اس انقیاد میں جتنا ہی کامل ہے وہ اسی قدر توحید میں کامل ہے،

راہ توحید کے سلوک کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی بندگی سے چھوٹ کر اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دیتا ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ قوم، ملک، وطن اور تمام رسوم و قیود سے آزاد ہو کر خدا کی طرف بھاگتا ہے، آخری درجہ یہ ہے کہ خوشی خوشی اس زندگی پر اللہ کے قریب اور اس کی معیت کو ترجیح دیتا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (الانعام ۶:۱۶۲-۱۶۳)

''کہہ دو، میری نماز اور میر قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں۔''

اسی طرح توحید کا اجتماعی اثر بھی نہایت گہرا ہے، انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات پر قائم ہے اور کامل عدل اور صحیح مساوات وحدت الٰہ اور وحدت آدم کے بغیر ناممکن ہے، دنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصل سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا کی سائنس نے ترقی کی ہے اس رفتار سے اس کے تمدنی شعور نے ترقی نہیں کی ہے سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسان نے ساری جغرافیائی حد بندیاں توڑ ڈالیں اور اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح بنا دیا ہے، لیکن دلوں اور دماغوں کی تنگی کا یہ حال ہے کہ ہر قوم کا خدا بھی الگ ہے اور ہر ایک اپنا آدم بھی الگ بنائے ہوئے ہے اگر اس طرح کے انسان کسی طرح اپنی حد بندیوں کو توڑ کر ایک دوسرے کے حدود میں گھس جائیں تو ان میں اس طرح کا جدال و قتال متوقع ہے جس کا ہم آج دنیا کی قوموں میں مشاہدہ کر رہے ہیں، ان کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں، لیکن ان کے دل درندوں کے ہیں ان کو قدرت نے دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی حد بندیوں کے ذریعہ سے الگ الگ کر رکھا ہے، لیکن سائنس نے یہ حدیں توڑ دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک دوسرے پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں اور ساری دنیا کا امن تاراج ہو گیا ہے، جو لوگ ان مشکلات پر غور کر رہے ہیں وہ اس نتیجہ تک پہنچ تو گئے ہیں کہ جن اصولوں پر ہمارے موجودہ تمدن و معاشرت کی عمارت قائم تھی وہ اصول موجودہ دنیا کے لیے ناکافی ہیں،

یہ بچپن کی لنگوٹی پورے قد کے انسان کے لیے نہایت تنگ ہے، اب ضرورت ہے کہ اس کے قامت کے لحاظ سے اس کے لیے نیا جامہ تراشا جائے، نسل اور رنگ، وطن اور سرزمین کی اساسات پر جن تمدنوں کی اٹھان ہوئی تھی اور جو سیاسی تنظیمات وجود میں آئی تھیں ان کے خاتمہ کا وقت آ گیا، اب دنیا کو ایک نئے نظم (NEW ORDER) کی تلاش ہے۔ لیکن وہ نیا نظم کیا ہو؟ اس سوال کا کوئی صحیح جواب اب تک نہیں دیا جا سکا، بعض کہتے ہیں کہ اب دنیا قومی اور ملکی حکومتوں کی جگہ ایک عالم گیر حکومت (WORLD STATE) ہے۔ جس کی بنیاد عالمگیر انسانیت کے تصور پر ہو، لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہ عالمگیر انسانیت کا مبارک تصور وجود میں کس طرح آئے جبکہ قوموں کی افراتفری کا یہ عالم ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے نہ آدم؟ ہر قوم کا دعویٰ یہ ہے کہ اَنَا وَلَا غَیْرِیْ ہر ایک کا خدا الگ ہے، اس کی نسل الگ ہے، اس کا باوا آدم الگ ہے، وہ اپنی تہذیب میں، اپنے معتقدات میں، اپنے اخلاق میں بالکل علیحدہ ہے اور اس علیحدگی کو نہ صرف باقی رکھنا چاہتی ہے، بلکہ دوسروں پر اس کو بالجبر مسلط بھی کرنا چاہتی ہے ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے ان قوموں میں اتحاد کے لیے کوئی مشترک سررشتہ موجود نہیں ہے مشترک سررشتہ صرف ایک ہو سکتا ہے کہ ایک ہی خدا کو سب اپنا خدا مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لیے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا سب اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلا شبہ ایک عالمگیر قومیت اور ایک عالمگیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے اور دنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مشکل کو حل کرنے کی اختیار کی جائیں گی وہ رشتہ میں ایک اور گرہ کا اضافہ کریں گی۔ کسی مشکل کو حل نہیں کریں گی۔

یہی راز ہے کہ قرآن نے ـــــ سورۂ نساء کے شروع میں ـــــ انسانی معاشرے کی بنیاد دو چیزوں پر قائم کی ہے: مذہب اور خاندان۔ پھر مذہب کی بنیاد توحید پر رکھی، یعنی صرف اللہ کو رب اور قانون دینے والا مانا جائے، دوسروں کے لیے اس میں کسی طرح کی حصہ داری نہ ہو۔ اور خاندان کی بنیاد وحدت آدم کے تصور پر رکھی، یعنی تمام نسل انسانی ایک ہی آدم سے ہے، کسی کو کسی پر فضیلت نہیں حاصل ہے مگر دین اور تقویٰ کی وجہ سے پہلی چیز نے خداؤں اور

الٰہوں کے تعدد اور قانون سازی اور حکمرانی کے مدعیوں کے تزاحم سے دنیا کو نجات دی اور دوسری چیز نے خاندان اور نسل ونسب کے سارے گھمنڈوں کو باطل کر دیا، سارے انسان ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کے بیٹے بن گئے۔ کالے اور گورے، عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں رہا، سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام ہے سب کے لیے یکساں امن ہے، یکساں عدل ہے، یکساں جدوجہد کا میدان ہے، یکساں استحقاق ہے اور یکساں ذمہ داری ہے یہاں کسی نسل کے متعلق یہ خیال قائم کر لینا کہ وہ پیدائشی غلام ہے شدید گناہ ہے یہاں ایرین اور سامی نسل کے درمیان کسی قسم کا امتیاز فساد فی الارض ہے یہاں ریڈ انڈین کو محض رنگ کی بنیاد پر حقوق سے محروم کرنا ظلم کبیر ہے اس نظام میں صرف وہ لوگ مساویانہ حقوق سے محروم ہیں جو ان اصولوں کے منکر ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انسانیت کے، امن وعدل کے دشمن ہیں، وہ زمین میں فساد چاہتے ہیں اور انسانی معاشرے کی ان اساسات کو ہدم کر دینا چاہتے ہیں جن سے محروم ہو کر دنیا کبھی چین نہیں حاصل کر سکتی۔

آج جو لوگ دنیا کے لیے نئے نظم کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ جب تک توحید کی حقیقت نہ سمجھ لیں، وہ کوئی ایسی اساس نہیں قائم کر سکتے جس پر تمام عالم انسانی کی اخوت کی عمارت قائم ہو سکے، انسان کے لیے یہ بات تو بالکل فطری ہے کہ وہ خدا کی بندگی واطاعت کرے یہ بات ایسی ہے جس کی دعوت تمام بنی آدم کو یکساں دی جا سکتی ہے اور ہر سلیم الفطرت انسان، خواہ وہ کسی قوم ونسل سے تعلق رکھتا ہو، بغیر کسی عصبیت کے، اس دعوت کو قبول کر سکتا ہے، اس کے اندر فطرت انسانی کے لیے ایک قدرتی کشش ہے، آفاق انفس، دونوں میں اس کی ناقابل انکار شہادتیں موجود ہیں، باقی اس کے سوا جتنے بھی دعوے ہیں سب دعاوی جاہلیت کے حکم میں داخل ہیں، فطرت انسانی کے اندر ان کے لیے نہ تو کوئی اپیل ہے نہ کائنات کے نظام سے ان کو ہم آہنگی حاصل ہے اگر ان میں سے کسی نظریے کو بھی بالجبر دنیا پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو لازماً دنیا کا مزاج اس کو اگلنے کی کوشش کرے گا اور اس کا نتیجہ یا تو یہ ہوگا کہ کوشش ناکام ہوگی یا کامیاب ہوگی تو اس کی حیثیت حلق کی پھانس کی ہوگی اور زمین کے ادیان باطلہ میں ایک دین باطل کا اور اضافہ ہو جائے گا۔

باب ۶

توحید کی اہمیت دین میں

پچھلے مباحث کو جن لوگوں نے غور سے پڑھا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہی کہ نظام دین میں توحید کو وہی جگہ حاصل ہے جو جسم انسانی میں دل کو حاصل ہے، اگر دل بیمار ہے تو سارا جسم بیمار ہے اور اگر دل تندرست ہے تو سارا جسم تندرست ہے توحید کے بغیر آدمی کا کوئی عمل مقبول نہیں ہے اور توحید کے ساتھ ہر غلطی کے بخشے جانے کی توقع ہے، چنانچہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے سوا جو کچھ ہے، جس کے لیے چاہے گا، معاف فرمائے گا۔

توحید کی اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ سارے دین کی عمارت تین چیزوں پر قائم ہے: توحید، رسالت اور معاد۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سارے دین کا ایک ثلث ہے، یہی وجہ ہے کہ سورۂ اخلاص کو، جو خالص توحید کی سورہ ہے، ثلث قرآن کہا گیا ہے، لیکن اگر مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ رسالت اور معاد بھی توحید کے تحت آتے ہیں رسالت کا جزو توحید ہونا یوں ثابت ہے کہ خدا ہی کو شارع اور قانون ساز ماننا بھی توحید کے مقتضیات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے احکام و قوانین اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہم مفصل بحث اپنی کتاب ''حقیقت رسالت'' میں کریں گے اور وضاحت کے ساتھ لَآ اِلٰـہَ کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے تعلق کی تشریح کریں گے۔ وہاں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اور زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ماننا توحید کا جزو لاینفک ہے جو شخص اللہ کو واحد کہتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی سے منحرف ہے، وہ قطعی مشرک ہے، اس کو توحید سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

باقی رہا معاد کا مسئلہ تو وہ توحید کے تحت مختلف پہلوؤں سے داخل ہے ہم اپنی کتاب

حقیقت معاد[1]، میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے کہ معاد خدا کے صفات کا لازمی اقتضاء ہے یہاں صرف اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ معاد کی ساری روح توحید ہے۔ جو لوگ معاد کے قائل ہیں، لیکن ساتھ ہی شرکاء وشفعاء کو بھی مانتے ہیں، جو ان کے زعم کے مطابق ان کو بخشوالیں گے، ان کے لیے معاد کا عقیدہ بالکل بے جان ہے، وہ خدا کے سامنے جواب دہی کی ذمہ داری اور اس کے قانون عدل کے ظہور سے ویسے ہی بے خوف ہو جاتے ہیں جیسے معاد کے منکرین چنانچہ اہل عرب اور یہود ونصاریٰ کا یہی حال تھا انہوں نے معاد کی ساری اہمیت شفاعت وکفارہ کے عقیدہ سے باطل کر دی تھی اور یہی حال مسلمانوں کے مبتدع گروہوں کا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کا بیان اکثر ساتھ ساتھ ہوتا ہے، کیونکہ معاد کی ساری حقیقت ہوا ہو جائے اگر توحید کے تصور میں ذرا بھی خلل واقع ہو، اس سے معلوم ہوا کہ دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے، اس جسم کی روح اور اس آنکھ کی پتلی توحید ہی ہے، اس کے بغیر نہ کوئی عقیدہ موثر ہے نہ کوئی عمل مثمر۔ یہیں سے دین کا پہلا قدم اٹھتا ہے اور پھر یہیں اس کا آخری قدم پڑتا ہے، یہ دین کا دائرہ ہے اور دین اسی وقت تک محفوظ ہے، جب تک اس دائرہ کے اندر ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں دین فطرت کے احکام وقوانین کی تعلیم دی ہے اس کا آغاز لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۲) (اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر) اور پھر ساری باتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۹) (یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں اور خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ کرو)۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا آغاز اور دین کی انتہا دونوں توحید ہے اور شرائع واحکام درحقیقت توحید کامل تک پہنچنے کے وسائل وذرائع ہیں۔

توحید کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء آئے سب نے اپنی دعوت کا آغاز توحید سے کیا اور اس نقطہ پر اس طرح جمے کہ کسی حال میں اس سے بال برابر

---

[1] افسوس ہے کہ یہ کتاب میں اب تک نہ لکھ سکا۔

سر کنے پر راضی نہ ہوئے، مخالفین نے لاکھ چاہا کہ پیغمبر اس معاملہ میں تھوڑی سی مداہنت گوارا کر لے، ذرا اپنے رویہ میں نرم ہو جائے، کم از کم ان کے بتوں کی تحقیر ہی سے باز آجائے تو آگے بڑھ کر اس سے سمجھوتہ کر لیں: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم ۶۸:۹) (یہ تو چاہتے ہیں کہ ذرا تم نرم پڑو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں گے)۔ لیکن پیغمبر نے ایک لمحہ کے لیے اس میں کسی قسم کی نرمی گوارا نہیں کی، انہوں نے مخالفتوں سے اس کو ڈرانا چاہا اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا، لیکن اس کو اس کی جگہ سے ہلا نہ سکے، انہوں نے ترغیب کے پھندے ڈالے اور رشوت میں وہ سب کچھ پیش کیا جو کر سکتے تھے، لیکن اسے رام نہ کر سکے، معزز ترین گھرانے میں شادی، دولت کے ڈھیر، سروری و سرداری، ساری ہی چیزیں پیش کی گئیں، لیکن ان ساری ترغیبوں کے جواب میں ان کے سامنے وہی توحید کی دعوت پیش گئی، جب ان تدبیروں میں ناکام رہے تو مخالفین نے آخری حربہ اٹھالیا اور پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے گھر کو، اپنے اعزہ کو، اپنے خاندان کو، اپنی املاک و جائداد کو اور اپنے وطن کو چھوڑ دیں۔ خدا کے ہر نبی نے اس کو بھی گوارا کر لیا، قرآن ہمارے سامنے موجود ہے، اس میں تمام انبیائے کرام کی ہجرت کی سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں، ان کو پڑھو، ہر نبی کی زبان پر اپنی قوم کو چھوڑتے وقت جو آخری کلمہ جاری ہوتا ہے وہ توحید کا کلمہ ہوتا ہے، یہی چیز ہے جس کے لیے وہ سب کچھ چھوڑتا ہے اور سب کو چھوڑ کر تنہا یہی چیز ہے جس کو اپنی معیت و رفاقت کے لیے منتخب کرتا ہے، غور کرو، ایسا کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ انسان سب کو چھوڑ دے مگر توحید پر حرف نہ آنے دے؟ بدر میں باپ نے بیٹے پر، چچا نے بھتیجے پر، ماموں نے بھانجے پر، بھائی نے بھائی پر توحید کی خاطر تلوار چلائی، اس کے لیے بیویوں نے شوہروں سے اور شوہروں نے بیویوں سے جدائی اختیار کر لی۔ عزیز سے عزیز قرابتوں اور محکم سے محکم روابط پر قینچی چل گئی اور ان لوگوں کے ہاتھوں سے چل گئی جو انسانیت کے گل سرسبد تھے، جو رحم و محبت اور اخلاص و وفا کے پیکر تھے، جن سے بڑھ کر اپنی قوم سے، اپنے قبیلہ سے، اپنے عزیزوں سے اور پھر عام انسانوں سے محبت کرنے والے لوگ اس زمین پر پیدا نہیں ہو سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگ جب گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ حکم دیتے ہیں کہ جس قبیلہ کا مجرم ہے اسی قبیلہ کے لوگ اسے قتل کر دیں:

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (البقرہ ۲:۵۴) (تو اپنے مجرموں کو اپنے ہاتھوں قتل کرو)۔ اور بدر کے قیدیوں کے متعلق فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہر شخص اپنے عزیز پر خود اپنے ہاتھ سے تلوار چلائے، اللہ اکبر! توحید کا حق یہ ہے کہ آدمی کا ایک ہاتھ اگر اس کی حرمت کو بٹہ لگائے تو اس کا دوسرا ہاتھ اس سے انتقام لینے میں ذرہ برابر رحم و مروت کو دخل نہ دے۔

توحید کی اس عظمت کی وجہ وہی ہے جو اوپر کے مختلف ابواب میں بیان ہو چکی ہے۔ توحید سب سے بڑے حق یعنی خدا کے حق کا اقرار ہے۔ یہی عدل و قسط کی بنیاد ہے جو شخص اس حق کو نہیں پہچانتا وہ کسی کے بھی حق کو نہیں پہچان سکتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کے حق کو بھی نہیں پہچانتا، اس سے اسی طرح کی ناانصافیاں اور تعدیاں ظہور میں آئیں گی جیسی کہ موجودہ زمانہ کے ظالم اور ناشکر گزار انسانوں سے ظہور میں آرہی ہیں، اور جس کی طرف ہم نے پچھلے باب میں اجمالی شارہ کیا ہے پس انبیائے کرام، جو یکسر حق اور انصاف کی دعوت ہوتے ہیں، وہ توحید کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں، جب کہ توحید ہی تمام حقوق کی بنیاد ہے وہ اس معاملہ میں نہ باپ کو معاف کر سکتے، نہ چچا کو، نہ بیٹے کو، جو چیز بھی اس حق کی ادائیگی میں مانع ہو، وہ ایک پتھر ہے اور ضروری ہے کہ اس پتھر کو راہ سے ہٹا دیا جائے۔

پس انبیائے کرام کی ساری جدوجہد کا مقصود توحید خالص کا قیام ہے وہ دنیا میں اسی لیے آتے ہیں کہ خدا کے بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص خدا کا بندہ بنا دیں، وہ اسی کو خالق مانیں، اسی کو بادشاہ کہیں، اسی کی بندگی کریں، اسی کی اطاعت کریں، اسی پر اعتماد و توکل کریں، اسی سے طالب مدد ہوں نعمت ملے تو اسی کا شکر ادا کریں، مصیبت آئے تو اسی سے استغاثہ کریں، طمع ہو یا خوف، امید ہو یا بیم، ہر حال میں ان کی نظر اسی کی طرف ہو، وہ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کر دیں۔ ان کی محبت اس کی محبت کے تابع، ان کی پسند اس کی پسند کے تحت ہو اس کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے حقوق میں اس کی یکتائی تسلیم کریں اور کسی پہلو سے ان چیزوں میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی نبی کو، نہ کسی ولی کو، نہ کسی اور کو، نہ اپنی ذات کو۔

توحید کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ اصل حقیقت

کے اعتبار سے توحید دین کا صرف ایک جزو نہیں ہے، بلکہ یہ سارے دین کو محیط ہے دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سے باہر دین کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے انبیاء یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور اسی پر ختم کرتے ہیں یہی راز ہے کہ قرآن مجید توحید سے شروع ہوتا ہے اور توحید پر ہی ختم ہوتا ہے، قرآن کی پہلی سورۂ، سورۂ فاتحہ ہے جس کی اصلی روح خدا کی خالص شکر گزاری اور کامل تفویض و تسلیم ہے اور آخر میں سورۂ نصر میں فتح مکہ کی بشارت اور سورۂ لہب میں باطل کی شکست کی پیشین گوئی کے بعد سورۂ اخلاص رکھی گئی جو خالص توحید کی سورہ ہے یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کا مرکزی نقطہ توحید ہے اور اب دین اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد معوذتین: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، رکھ دی گئی ہیں، جو شیطان کی آفتوں سے اس خزانہء توحید کی حفاظت کر رہی ہیں کیونکہ یہ معلوم ہے کہ شیطان کو بنی آدم سے جو حسد ہے اس حسد کے جوش میں اس کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ انسان کو توحید کے نقطہ سے ہٹا دے، چنانچہ اسی وجہ سے اس نے کہا: لَاَ قْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (الاعرف ۷:۱۶) (سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا)۔ یعنی ان کو توحید کے رستہ پر قائم نہ رہنے دوں گا: وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (الاعراف ۷:۱۷) (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا) یعنی وہ شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

فاران فاؤنڈیشن